سیرۃ النبی

رسول اللہ صلعم کے حالات وغزوات، اخلاق وعادات اور تعلیم وارشاد کا یہ عظیم الشان
ذخیرہ جسکا نام سیرۃ النبی تو عام طور سے مشہور ہی، مسلمانون کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت
اہتمام کیساتھ مرتب کیا ہے،

ابتک اس کتاب کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہین، پہلے میں ولادت سے لے کر فتح مکہ تک کے حالات اور
غزوات ہیں، اور ابتدا میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہی، جسمیں فن سیرت کی تنقید د تاریخ ہی، دوسرے حصہ
تکمیل دین، تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق وعادات، اعمال وعبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل
بیان ہی، تیسرے حصہ میں آپکے معجزات وخصائص نبوت پر بحث ہی، اسمیں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر
متعدد اصولی بحثیں کیگئی ہیں، پھر ان معجزات کی تفصیل ہی جو بروایات صحیحہ ثابت ہیں، اسکے بعد ان معجزات کے متعلق
غلط روایات کی تنقید وتفصیل کی گئی ہی، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہی جو آپکے ذریعہ مسلمانون کو
تعلیم کئے گئے ہیں، کوشش کی گئی ہی کہ اس میں قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائیں،
پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت، عبادت کی تفصیل وتشریح اور ان کے مصالح وحکم کا بیان ہی، اور
دوسرے مذاہب کے عبادات سے ان کا مقابلہ وموازنہ ہے،

چھٹا حصہ جو اخلاق پر مشتمل ہے، اس وقت زیر طبع ہی،

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اوّل تقطیع خورد للعہ، حصہ دوم تقطیع کلان تےؔ، تقطیع خورد صہ و ؁
حصہ سوم تقطیع کلاں سےؔ وللعہ، تقطیع خورد معہ وصہ، حصہ چہارم تقطیع کلاں ہے روپے، تقطیع خورد
معہ وصہ، حصہ پنجم تقطیع کلاں صہ وللعہ

(منیجر دار المصنفین اعظم گڈہ)

جلد ۴۲	ماہ رجب المرجب ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۳۸ء	عدد ۳

مضامین

شذرات

ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کی ملی جلی زبان کا نام ہندوستانی رکھا گیا، اور جس کو کانگریس نے بار بار دیس کی عام زبان کے نام سے پکارا، اور جس کی تعریف یہ کی گئی کہ جو شمالی ہندوستان میں عام طور سے بولی جاتی ہے، اور جو عربی اور سنسکرت کے نامانوس لفظوں سے پاک ہے، راجندر عبد الحق معاہدہ میں یہی لفظ ہیں، گاندھی جی نے یہی کہا، جواہر لال جی نے یہی بتایا، مولانا ابو الکلام نے یہی فرمایا، اور ہم کو اطمینان ہوگیا کہ کانگریس کے "ہائی کمانڈ" کے حکم کے آگے اب کسی کانگریسی گورنمنٹ کے ممبر کو سرتابی کی جرأت نہ ہوگی، ڈاکٹر کھرے کی نظیر بھی سامنے تھی،

مگر معلوم ہوا کہ وردھا کے پایۂ تخت سے ناگپور جتنا قریب ہے لکھنؤ اس سے بہت دور ہے، اسلئے ہائی کمانڈ کی سرتابی کی جو سزا ناگپور میں مل سکتی ہے وہ لکھنؤ میں نہیں مل سکتی، یوپی گورنمنٹ کے عہدہ دار اور ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپلٹی کے افسر ہندوستانی کے بجائے علانیہ ہندی کے رواج پر تلے ہوئے ہیں، خصوصیت کیساتھ آنریبل سمپورنانند جی وزیر تعلیم کے رویہ کی سخت شکایت ہے کہ وہ صاف صاف کانگریس کے حکم کو توڑ رہے ہیں، اور اپنی پبلک تقریروں میں وہ کچھ کہہ رہے ہیں جو ان جیسے وفادار کانگریسیوں کو نہیں کہنا چاہئے،

اس وقت ہمارے سامنے ہمارے وزیر تعلیم کی وہ تقریر ہے جو بنارس میں انھوں نے ۱۹ ر اگست ۱۹۳۸ء

کی شام کو ناگری پرچارنی سبھا کے ایڈریس کے جواب میں فرمائی، اور جس میں یہ ارشاد ہوا،

"ہندی نہ صرف شمالی ہند کی مادری زبان ہے، بلکہ وہ ہندوستان کی "لنگوا فرینکا" ہے، یہ ایسی ہونی چاہئے جس کو آسانی سے نہ صرف بنگال اور گجرات کے لوگ بول اور سمجھ سکیں، بلکہ وہ بھی جو دکنی ہند میں رہتے ہیں، اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ ہندی جس کو ہندوستانی بھی کہا جاتا ہے (!) ہمارے دکھنی بھائی بھی آسانی سے سیکھ لیں تو یہ ضروری ہے کہ ہم بہت کافی بڑی تعداد میں سنسکرت لفظ استعمال کریں"۔ (اسٹیٹسمین ۱۶ ر اگست ۱۹۳۸ء)

اب یوپی کانگریس کی زبان حال ہفتہ وار ہندستان کا ایک ٹکڑہ ملاحظہ ہو:۔

"مدراس کی کانگریسی وزارت نے طے کرلیا ہے کہ مدراس میں مقامی زبانوں کے ساتھ ساتھ ہندوستانی زبان کی ابتدائی تعلیم لازمی کردیجائے گی، کیونکہ اس وقت یہی ایک زبان ہے جو ہندوستان کی مشترکہ زبان کہی جاسکتی ہے، ہندوستانی زبان سے وہ زبان مراد ہے، جو سنسکرت اور عربی فارسی کے بھاری لفظوں سے خالی ہے، تمام شمالی ہند اور دکن میں بولی اور سمجھی جاتی ہے، اور اردو و ہندی دونوں رسم الخط میں لکھی جاتی ہے"

(۲۸ ر اگست ۱۹۳۸ء)

کیا یہ دونوں ٹکڑے کسی ایک سبھا کے ذمہ داروں کے بیان ہیں؟

کہئے یہ حکم رہے، کہئے وہ ارشاد رہے،

اگر یہ دلیل صحیح ہے کہ دکھن کے ہندوؤں کے سمجھنے کے لئے سنسکرت لفظوں کو کافی بڑی تعداد میں اس زبان میں ملانا چاہئے، تو یہ دلیل کیوں غلط ہوگی کہ آٹھ کروڑ مسلمانوں کے سمجھنے کے لئے ضروری

ہے کہ اس میں کافی بڑی تعداد میں عربی اور فارسی کے لفظ بولے جائیں، واقعہ یہ ہے کہ کانگریس کو جتنا اس کے نادان دوستوں نے نقصان پہنچایا ہے، اتنا اس کے دشمنوں نے نہیں،

بمبئی کے اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن کا تذکرہ ان صفحوں میں کئی دفعہ آیا ہے، اس کی عمر کا یہ چھٹا سال ہے، اس نے اتنے عرصہ میں کئی رسالے اور کتابیں شائع کی ہیں جنہیں سے ایک مشہور صوفی ابوسعید خزار (۲۸۶ھ) کی عربی صوفیانہ کتاب، کتاب الصدق ہے، جو پچھلے سال چھپکر نکلی ہے، ایسوسی ایشن کے لائق سکرٹری آصف فیضی صاحب پوری تن دہی سے اس کو چلا رہے ہیں، مقدمۂ ابن خلدون کا انگریزی ترجمہ بھی جس کو پروفیسر دلدُ پوتا کر رہے ہیں، اسی کی طرف سے چھپنے والا ہے،

ہمارے فاضل دوست پرنسپل محمد شفیع صاحب (لاہور) اپنے اورنٹیل میگزین کے ذریعہ سے ہمیشہ مفید کتابیں روشناس کرتے ہیں، ابھی حال میں انھوں نے آداب الحرب کے نام سے ہم کو اسلامی فن جنگ کی ایک فارسی کتاب سے آشنا کیا ہے، جو اسلامی ہند میں سلطان التمش کے زمانہ میں لکھی گئی تھی، اس کا ایک نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں اور دوسرا انڈیا آفس میں ہے، ہندوستانی مسلمانوں کی فنی ترقی کا یہ گوشہ اب تک چھپا تھا،

مصر کی ایک اطلاع سے یہ معلوم ہو کر خوشی ہوئی کہ مولوی حافظ عمران خان صاحب ندوی جو جامع ازہر کے درجۂ تکمیل میں تعلیم پا رہے ہیں، پہلے سال کے امتحان میں اول آئے ہیں، ۲۷ شریک امتحان میں سے ۱۹ پاس ہوئے، جن میں ہم اول ہیں، انہیں ایک حافظ صاحب ہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں کامیاب واپس لائے،

مقالات

اقبال علیہ الرحمۃ

کے

چند جواہر ریزے

از جناب پروفیسر خواجہ عبدالحمید صاحب، لکچرار، گورنمنٹ کالج، ملتان،

(۲)

۱۲- ۱۹۲۶ء کے شروع میں ایک شام کو میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں بحیثیت مدیر کریسنٹ (رسالہ اسلامیہ کالج لاہور) حاضر ہوا، اور ملتجی ہوا کہ نئے سال کا پہلا نمبر نکلنا ہے، براہ کرم کوئی پیغام یا ارشاد طلبہ کے لئے دیجئے، تاکہ پہلے ورق پر اسے چھاپا جائے، فرمانے لگے مضمون لکھنے کا تو وقت نہیں البتہ یہ شعر چھاپ دو،

پشیمان شو اگر لعلے ز میراث پدر خواہی — کجا عیش برون آوردن لعلے کہ در سنگ است

میں نے اسے چھاپ دیا، اس سے بہتر پیغام مسلمان طلبہ کے لئے تو شاید ناممکن تھا،

۱۳- ۱۹۲۷ء یا ۱۹۲۸ء میں جب مسٹر منوہر لال وزیر تعلیم پنجاب تھے، تو مسلمانوں میں اپنی حق تلفی کا بہت چرچا تھا، ڈائرکٹر صاحب محکمۂ تعلیمات پنجاب ان دنوں سر جارج انڈرسن تھے، مسلمان ممبران کونسل کا ایک مختصر سا وفد اس معاملہ پر بحث کرنے کے لئے ڈائرکٹر صاحب کے پاس گیا، ڈاکٹر صاحب چونکہ ان دنوں کونسل کے ممبر تھے، اور تعلیمی حالات سے واقف، وہ بھی وفد میں شامل

تھے، اور ایسی باتیں جو ایسے موقعوں پر ہوتی ہیں ہوئیں، ڈاکٹر صاحب بہادر نے وعدہ فرمایا کہ میں ضرور اس معاملہ پر غور کروں گا، اور جہاں جہاں حق تلفی یا بے قاعدگی ہوئی ہے، اسکی تلافی کی پوری کوشش کرونگا، ڈاکٹر صاحب نے فوراً ظرافت سقراط سے کام لیا، اور سر جارج سے فرمانے لگے، اجی صاحب آپ اتنی کاوش مت کیجئے گا، ہم لوگ تو مسلمان ہیں، آپ کے اس وعدہ ہی سے خوش ہو گئے ہیں، اب کچھ کرنے کرانے کی ضرورت نہیں،

۱۴۔ ۱۹۲۲ء میں جب ڈاکٹر صاحب کو نائٹ ہڈ (Knight hood) کا خطاب ملا، تو اسلامیہ کالج کے کریسنٹ ہوسٹل کے طلبہ نے آپ کو چائے پر مدعو کیا، ڈاکٹر صاحب نے کمال مہربانی سے (جو ان کا عمر بھر شیوہ رہی) یہ دعوت قبول فرمائی، چنانچہ وقت مقررہ پر آپ تشریف لائے، آپ کے دوست نواب سر ذوالفقار علی خان صاحب بھی ساتھ تھے، چائے کے بعد طلبہ نے درخواست کی، کہ ان کی ہدایت کے لئے چند کلمات فرمائے جائیں، ڈاکٹر صاحب نے ایک مختصر سی تقریر کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ قوموں کے اخلاق کو خراب کرنے والی چیزوں میں سے ایک نہایت خطرناک بلکہ مہلک چیز وہ نظریہ ہے، جسے "فن برائے فن" (art for art's sake) کہتے ہیں، اس نظریہ سے مراد یہ ہے کہ جمالیات کا ہر شعبہ یا فن صرف اپنے اصولوں کو ہی اپنا معیار صحت اور نصب العین مقرر کرے، اپنے ان اصولوں سے باہر کوئی اصول (مثلاً اخلاقیات یا روحانیات کا کوئی اصول) اس فن کی راہبری کا حقدار نہ ہو، وہ فن خود اپنا راہبر ہو، اس کی ترویج یا ترتیب یا اس کا ارتقاء کسی فوق الفن اصول کے ماتحت نہ ہو، وغیرہ، مختصر یہ کہ حسن خود اپنا معیار ہے، اور اپنے سے بالاتر کسی معیار یا مدعا یا نصب العین کو ماننے کے لئے تیار نہیں، یہ نظریہ آج کل مغربی دنیا میں بہت مقبول ہے، اور اسکی مقبولیت کی رفتار اگر اسی طرح تیز رہی تو مجھے یقین ہے کہ وہ ان اقوام کو گرا کر رہیگا، میں نے اپنے کلام میں اس مہلک نظریہ کے خلاف جہاد کیا ہے، اور میں تم نوجوانوں کو متنبہ

کرتا ہوں کہ اس خطرناک غلطی میں نہ پڑنا، فن جب اخلاقیات اور حیاتیات سے علیحدہ ہوتا ہے تو وہ بہت جلد مخرب اخلاق بن جاتا ہے، اعلیٰ مقاصد کی تکمیل یا پیروی کے لئے جمالیات کے کسی فن کو لوگے تو وہ اپنے بہترین مدارج طے کریگا، اور قوم و ملت میں ایک نئی روح پھونک دیگا، لیکن وہی فن جب ان مقاصد سے بچھڑ جائے گا، تو قوم و ملت کے حق میں زہر قاتل بنے گا"

میں نے اوپر ڈاکٹر صاحب کی مختصر تقریر کا ماحصل (جو شاید دس بارہ منٹ سے زیادہ نہ تھی) اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے، بالخصوص اس نظریہ "فن برائے فن" کی تعریف کو واضح کرکے بیان کرنا میں نے مناسب سمجھا، اس تقریر سے مجھے کئی سال گذر چکے ہیں لیکن بعد کے واقعات نے ان خیالات کو میرے ذہن سے محو ہونے نہیں دیا، ہر طرف "فن برائے فن" کی تباہ کاریاں ایک وبا کی صورت اختیار کر رہی ہیں، جرمنی اور اٹلی میں تو ہٹلر اور مسولینی کی کوششوں نے اس نظریہ کی اچھی خاصی بیخ کنی کی ہے، لیکن دوسرے مشہور مغربی ممالک میں اس کے خلاف کوئی منظم جہاد نہیں کیا گیا، ہندوستان میں کچھ عرصہ سے یہ نظریہ نام نہاد تعلیم یافتہ طبقہ میں رائج ہو رہا ہے، آزاد خیال فنین (artists) اس کے مبلغ ہیں اور عریانیت ان کے فن کے اسرار کی کلید، ڈاکٹر صاحب نے اس نظریہ کے مہلک نتائج کو جگہ جگہ اپنی تصانیف میں مثلاً محکوم اور زوال پذیر اقوام کے جمالیات کے تذکرہ میں بیان کیا ہے، اس نظریہ کے برعکس انھوں نے اپنی تعلیم اس شعر میں نہایت بلیغ طریقہ سے بیان کی ہے،

دلبری بے قاہری جادوگری است   دلبری با قاہری پیغمبری است

۱۵۔ ۱۹۲۶ء میں میں نے اسلامیہ کالج کو چھوڑا، ممبران سٹاف نے کمال مہربانی سے چائے کی ضیافت دی، ڈاکٹر صاحب سے چونکہ مجھے عقیدت تھی، اس لئے انھیں بھی مدعو کیا گیا (یعنی اساتذہ کے علاوہ صرف وہی مہمان تھے،) وہ ازراہ ذرہ نوازی شامل ہوئے، باتیں ہوتی رہیں، دوران گفتگو میں منتظم صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی شرکت کا شکریہ ادا کیا، فرمانے لگے پروفیسر میرا دوست ہے، اس کے ملازمتی جنازہ کے لئے مجھے ضرور

وقت نکالنا تھا"، (The professer is my friend - I had to find time for his official funeral) اس پر قہقہہ پڑا، فرمانے لگے، کہ میں نے ان [illegible] پارٹیون کے لئے "ملازمتی جنازے" کی اصطلاح وضع کی ہے،

اس پارٹی میں ڈاکٹر صاحب، مسٹر یوسف علی (جو پرنسپل تھے) کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی رہے تھے، باتون باتون میں پردہ کا معاملہ زیر بحث آیا، یوسف علی صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کیون صاحب آپ کو تو پردہ کی مخالفت ضرور کرنی چاہئے؟ انھون نے جواب دیا کہ میں تو پردہ کا بہت حامی ہون، یوسف علی صاحب نے وجہ دریافت کی، تو فرمایا کہ پردہ سے جنسیت کی خواہش تیز تر ہوتی ہے بے پردگی اور عریانی سے وہ راز کھل جاتا ہے، جو جنسیت کی جان ہے، اس مختصر سے جواب میں انھون نے انسانی نفسیات کے ایک اہم اصول کو لطیف پیرایہ میں بیان کر دیا،

۱۶- ڈاکٹر صاحب کو پورا یقین تھا کہ ان کا کلام اور ان کا کام باقی رہے گا، عرصہ ہوا، میں نے ایک روز عرض کی کہ یورپی زبانون میں آپ کا کلام اگر ترجمہ کی صورت میں شائع ہو جائے تو نہ صرف خود یورپ کے حق میں مفید ہوگا، بلکہ صحیح اسلامی نقطۂ نگاہ اور تعلیم کے متعلق بھی اہل یورپ میں جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں، وہ بہت حد تک دور ہو جائیں گی، آپ ترجمہ کی اجازت ضرور دیں، فرمانے لگے، کہ میرا کلام باقی رہے گا، (My work shall live) تراجم آہستہ آہستہ ہو ہی جائیں گے،

۱۷- گول میز کانفرنس کے سلسلہ میں انگلستان میں ڈاکٹر صاحب کو اکابر اور فضلاء سے تبادلۂ خیالات کا موقع ملا، ایک بزرگ نے عیسائی پادریوں کا مشہور اور جھوٹا اعتراض اسلام کے خلاف دہرایا، اور پوچھا کہ سر محمد کیا یہ سچ ہے، کہ اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ عورت کے روح نہیں ہوتی"؟ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا کیا روح سے آپ کی مراد وہی شے ہے، جو آپ لوگون کے خیال میں جسم سے بالکل علیحدہ اور

مختلف ہوتی ہے" معترض صاحب نے کہا جی ہان انھون نے جواب دیا، "تو پھر صاحب اسلام کے مطابق عورت کیا مرد میں بھی روح نہیں ہے" اس دقیق اور لطیف جواب کو سمجھنے کے لئے یہ یاد رکھنا چاہئے، کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے فلسفیانہ مضامین میں اس نظریہ پر بہت زور دیا ہے، کہ روح اور جسم کی تقسیم قرآنی تعلیم کے بالکل خلاف ہے اور یہ پرانے مذاہب اور فلاسفہ کی غلط تعلیم کا نتیجہ ہے، قرآن کے مطابق انسان ایک فرد ہے جس میں روحانی اور جسمانی خاصیتیں موجود ہیں، لیکن روح اور جسم دو الگ الگ چیزیں موجود نہیں جن سے وہ بنا ہو، روح اور جسم کی یہی غلط تقسیم ہے، جس کی وجہ سے بیسیوں ناقابل حل مسئلے فلسفۂ مذہب میں پیدا ہو چکے ہیں، اسلام انسان کو ایک زندہ شخصیت (Spiritual and organic being) تصور کرتا ہے، اور یہ تصور قرآن میں نہ صرف اسی ارضی زندگی کے لئے استعمال ہوتا ہے، بلکہ حشر اور حیات بعد الموت کے لئے بھی قائم رہتا ہے، چنانچہ حیات بعد الموت میں انسان کے لئے جو جزا اور سزا مقرر ہے، جس کا ذکر قرآن میں بار بار آتا ہے، وہ روحانی بھی ہے اور جسمانی بھی، ڈاکٹر صاحب نے مندرجۂ بالا جواب میں اسی مسئلہ کو واضح کیا ہے، کہ اسلام کے مطابق روح جسم سے علیحدہ کوئی شئے نہیں، اس لئے نہ وہ عورت میں پائی جاتی ہے اور نہ مرد میں، کس بلاغت اور ظرافت سے ایک ہی بات میں نہ صرف ایک جھوٹے الزام کی تردید کی گئی ہے بلکہ ایک اہم اصول کو بھی واضح کر دیا گیا ہے، ڈاکٹر صاحب کی روزمرہ کی گفتگو میں یہی خاصیت بار بار نمایاں ہوتی تھی،

۱۸- دوسری گول میز کانفرنس کے زمانہ میں انگلستان کی مشہور سیاح خاتون مس روزیتا فوربس (Miss Rosita Forbes) نے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کا شوق ظاہر کیا، چنانچہ مس صاحبہ نے انھیں اپنے ہان مدعو کیا، یہ خاتون شمالی افریقہ اور اسلامی ممالک میں بہت پھری ہیں، اور ان پر اس سیاحت کا بہت اچھا اثر پڑا ہے، ڈاکٹر صاحب فرماتے تھے، کہ ان کا محل جو

لندن میں ہے، وہ ایشیائی بلکہ اسلامی طرزِ آرایش کا نہایت لطیف اور شستہ نمونہ ہے، ساماں آرایش غالیچے زیب و زینت کے انداز ہر لحاظ سے معلوم ہوتا ہے، کہ ہارون الرشید کے بغداد کے کسی محل کا نمونہ ہے، اسی محل میں ڈاکٹر صاحب کی ضیافت ہوئی، اور پر لطف مجلس رہی لیکن انھیں خاتون کے محل کی تعریف کا موقع نہ ملا، روانگی کے وقت مس صاحبہ سے نہ رہا گیا، پوچھنے لگیں "سر محمدؐ میرے اس مکان کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے،؟ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا "آپ نے اپنی بہشت دنیا میں پائی، میں اپنی بہشت کا منتظر ہوں"۔

۱۹- دوسری گول میز کانفرنس سے واپسی پر ڈاکٹر صاحب کی ملاقات روما میں مسولینی سے ہوئی، اس ملاقات میں موسولینی نے ان کی تعلیم سے دلچسپی کا اظہار کیا، اور اسکی تعریف کی، گفتگو آدھ گھنٹے تک رہی دوران گفتگو میں قوم اور مذہب کا بھی ذکر ہوا، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اطالیہ کی موجودہ حالت (اور اس کی حل طلب مشکل) بہت حد تک ایسی ہے، جیسے کہ قبل از اسلام ایران کی تھی، ایران کی تہذیب فرسودہ تھی، اور قوم کے قوائے شل ہو چکے تھے، ان کو تازہ خون کی ضرورت تھی، ایران کی خوش قسمتی سے اس کے جوار میں عرب کی جری اور بادیہ پیما قوم تھی، جس نے ایران کو اپنا تازہ اور خالص خون دیا، نتیجہ یہ ہوا، کہ ایران میں حیات کی ایک نئی لہر دوڑ گئی، اور یہ قوم ایک پُرشکوہ تہذیب کی حامل اور علم بردار ہوئی، عربی خون کی بدولت ان میں بہترین اہلِ فن، اہلِ سیاست، اور اہلِ سیف پیدا ہوئے، اسی طرح روما کے زوال کے بعد گاتھ اور جرمن قوموں نے اطالیہ کو اپنا خون دیا، اور اسے قرونِ وسطیٰ میں نشأۃ ثانیہ نصیب ہوئی، اب پھر ایران اور اطالیہ دونوں کو تازہ خون کی ضرورت ہے، ایران اب بھی اس لحاظ سے خوش قسمت ہے، کہ اس کے شمال میں جری اور نیم مہذب ترکمان موجود ہیں، اور مغرب میں اندرون عرب کے جری قبائل، یہ قومیں اپنا خون دیکر ایران کو پھر زندہ اور قوی کر دیں گی، لیکن موجودہ اطالیہ کے گرد اسی کی جیسی مہذب قومیں آباد ہیں

جن میں صحرائی وحشت اور تازگی نام کو موجود نہیں، اطالیہ تازہ خون کہاں سے لیگی؟" ڈاکٹر صاحب فرماتے تھے، کہ موسولینی اس اچھوتے خیال سے بہت متاثر ہوا،

۲۰- ڈاکٹر صاحب پر حُسن کا اثر بہت گہرا اور فوری ہوتا تھا، روما کے اسی قیام کے زمانہ میں (جو صرف چند روزہ تھا) ان کی ایک دوست خاتون نے (غالباً اسی خاتون نے موسولینی کی ملاقات کے لئے وقت مقرر کرایا تھا) جو اطالیہ کے طبقۂ امراء سے تھی، ان سے دریافت کیا، اگر آپ کو یہاں کوئی خاص چیز دیکھنی ہے، تو فرمائیے،؟ تاکہ اس کا انتظام کیا جائے، فرمایا کہ اطالیہ کا حسن مشہور ہے، میں اس شہر روما کی حسین ترین خواتین دیکھنا چاہتا ہوں، چنانچہ موصوفہ نے ایک ٹی پارٹی میں اعلیٰ سوسائٹی کی چند حسین خواتین مدعو کیں، جن سے ڈاکٹر صاحب نے ملاقات کی، فرماتے تھے، کہ اطالیہ کا حسن یورپ میں بہترین ہے، اور اس ضیافت میں روما کے حسن کے بعض نہایت لطیف نمونے تھے،

۲۱- گول میز کانفرنس سے واپسی پر ڈاکٹر صاحب کی ملاقات پیرس میں پروفیسر برگسان سے ہوئی، برگسان کی تصانیف کا اثر ان پر بہت تھا، اس کا نظریہ "واقعیت زمان" (Reality of Time) ڈاکٹر صاحب کے خیال میں اسلامی نقطۂ نگاہ کے بہت قریب تھا، چنانچہ دورانِ ملاقات میں اس پر بحث ہوئی، ڈاکٹر صاحب نے برگسان کو یہ حدیث سنائی، کہ "زمانہ کو برامت کہو کہ زمانہ خدا ہے" فرماتے تھے، کہ جس وقت برگسان نے یہ حدیث سُنی تو وہ کرسی سے اچھل کر آگے بڑھا اور مجھ سے پوچھنے لگا کیا یہ سچ ہے"؟

۲۲- گول میز کانفرنس کے اختتام پر ڈاکٹر صاحب نے ہسپانیہ کا سفر کیا، اس سفر کے واقعات انھوں نے کمال مہربانی سے مجھے مفصل سنائے قرطبہ کے جس ہوٹل میں آپ ٹھہرے تھے، اس کے مالک (منیجر) سے آپنے سب سے پہلے یہی پوچھا کہ کیا اس علاقہ میں قدیم مراکشی نسل کے لوگ آباد ہیں اس نے جواب دیا، کہ بڑی تعداد میں، آپنے خواہش ظاہر کی کہ مجھے ان میں سے کسی ایک سے ضرور ملایا جائے

مینیجر مسکرا کر بولا، اس کام کے لئے ہوٹل سے باہر جانے کی ضرورت نہیں، میں خود مراکشی اصل سے ہوں (جنوبی ہسپانیہ کے ان باشندوں کو مورسکو (Morisco) کہا جاتا ہے) حسن اتفاق سے آپ کو پرانی عمارتیں دکھانے کے لئے جو راہبر مقرر کیا گیا تھا، (آپ نے شرط یہ رکھی تھی، کہ راہبر انگریزی جانتا ہو، کیونکہ میں ہسپانوی زبان سے آشنا نہیں) وہ بھی مراکشی اصل سے تھا، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اس علاقہ میں عربی مراکشی اثر چہروں کی ساخت میں بہت نمایاں ہے، چنانچہ مسجد قرطبہ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے،

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشم غزال ۔ اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشین

بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے ۔ رنگ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

اسی سفر ہسپانیہ میں آپ کو پروفیسر آسین (Asin Palacios) سے بھی ملاقات کا موقع ملا، یہ وہی پروفیسر ہیں، جنھوں نے قریبًا پندرہ سال یا شاید کچھ زیادہ ہوتے ہیں، ایک معرکۃ الآرا تصنیف کی تھی جس میں یہ ثابت کیا تھا، کہ اطالوی شاعر دانتے پر عربی بالخصوص ان حدیثوں اور روایتوں کا اثر جو معراج نبوی صلعم اور عذاب دوزخ سے متعلق ہیں، کسی قدر غالب تھا، دانتے کی شہرۂ آفاق تصنیف ڈیوائنا کامیڈیا میں یہ اثر صفحہ صفحہ پر نمایاں ہے، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، کہ پروفیسر آسین کی خواہش تھی کہ مسلمان طالب علم بالخصوص ہندوستان کے مسلمان طالب علم ہسپانیہ میں آئیں، اور ملک کی زبان سیکھ کر ان قیمتی اور بے شمار عربی مخطوطوں کا مطالعہ کریں، جو ہسپانیہ کے بعض کتب خانوں مثلاً اسکوریال میں بند پڑے ہیں، (خدا جانے اس خوفناک جنگ میں ان نایاب مخطوطوں کو کسقدر نقصان پہونچا ہو)

ڈاکٹر صاحب کو سفر ہسپانیہ میں معلوم ہوا، کہ اس ملک میں قومیت اور وطنیت کی ایک نئی لہر دوڑ رہی تھی، ملک میں ایسے نوجوان اور فضلا نکل آئے تھے، جو ہفت صد سالہ اسلامی

حکومت ہسپانیہ کے کارناموں کو فخریہ بیان کرتے تھے، اور اس دور کو اندلس کا بہترین زمانہ کہکر یاد کرتے تھے، اسی تحریک کا نتیجہ تھا، کہ مسجد قرطبہ کو کیتھولک چرچ کے مختلف فرقوں سے چھین لیا گیا، حالانکہ کئی سو سال سے ان فرقوں نے مسجد کے مختلف حصوں میں اپنی عبادتگاہیں بنالی تھیں، وطنیت کی اس تحریک کا چونکہ مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا، اس لئے مسجد کو محکمۂ آثار قدیمہ کے حوالے کر دیا گیا، اس ضمن میں ڈاکٹر صاحب نے حکمت الٰہی کی ایک دلپذیر مثال یہ سنائی کہ مسلمانوں کے اخراج کے بعد جب مسجد قرطبہ (جو تعمیری جمالیات کے لحاظ سے دنیا کی نادر ترین عمارتوں میں سے ہے) عیسائی راہبوں کے قبضہ میں آئی، تو انھوں نے آیات قرآنی پر جو سنہری حروف میں مسجد کی دیواروں اور محرابوں پر لکھی ہوئی تھیں، پلستر کرادیا، آج قریبًا پانچ چھ سو سال کے بعد جب وہ پلستر محکمۂ آثار قدیمہ کے حکم سے اکھاڑا جاتا ہے، تو وہی نقوش اپنی پرانی شان میں دنیا کے سامنے آتے ہیں اگر پلستر نہ ہوتا، تو یہ نقوش غالبًا اس وقت تک بالکل محو ہو جاتے، ڈاکٹر صاحب کا یہ فقرہ میرے ذہن میں نقش ہے، کہ "مسجد اور اس کے نقوش کو دیکھکر جو لذت قرآن اور اسلام کے مفہوم کے متعلق میں نے حاصل کی، وہ بیسیوں تفسیروں سے حاصل نہ کر سکا"، ایک بات ڈاکٹر صاحب کو اسپین کے سفر میں خاص طور سے نوٹ کرنی پڑی، کہ اس وقت اس ملک میں پرانی مساجد کی تعداد بہت ہی کم ہے، ان کا خیال تھا کہ اسکی دو وجہیں ہو سکتی ہیں، یا مسلمانوں کے ہسپانیہ سے اخراج کے بعد تعصب کی وجہ سے عیسائیوں نے ان تمام مساجد کو سخت بے دردی سے گرا دیا ہوگا، اور یا خود مراکشی اندلسی مسلمانوں کو بے ضرورت مساجد تعمیر کرنے کا وہ شوق نہ تھا، جو ہندوستانی مسلمانوں کو ہے، پہلا خیال غالبًا زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے،

ڈاکٹر صاحب ہسپانیہ کی آب و ہوا کی بجد تعریف کرتے تھے، فرماتے تھے، کہ اس

ملک میں دو تین مقامات ایسے ہیں، اور ان کی فضا، اس قدر پاک اور شستہ ہو کہ آج کا پکا ہوا سالن کئی مہینوں تک نہ بگڑے گا،

۲۳- دو سال کے قریب ہوئے جب اسپین کی موجودہ ملکی جنگ کا آغاز ہوا تو یہ خبریں بھی پہونچنا شروع ہوئیں، کہ جنرل فرانکو کی فوج کا زیادہ حصّہ خصوصًا وہ حصّہ جو یلغاروں میں اور فیصلہ کن لڑائیوں میں، (Storm Troops) صف شکنوں کا کام دیتا ہے تمام تر مراکشی سپاہیوں اور رضا کاروں پر مشتمل ہے، کچھ عرصہ کے بعد ان جفاکش اور جری سپاہیوں کی تصاویر بھی اخباروں میں چھپنا شروع ہوئیں، ان خبرون سے ہندوستان کے ہر پڑھے لکھے مسلمان پر گہرا اثر ہوا تھا اور ہے، مین نے ایک روز ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں اس خیال کے اثر کا ذکر کیا، کہ سرزمین اندلس قریبًا بارہ سو سال کے بعد پھر مسلمان مراکشی بہادرن کے قوی بازوؤں سے سر ہو رہی ہے، ڈاکٹر صاحب فورًا بولے تمھیں میری نظم مسجد قرطبہ کا آخری بند یاد نہیں رہا، اسمیں میں نے پیشینگوئی کی تھی،

آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی — دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کے خواب!

عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں — میری نگاہوں میں ہے، اسکی سحر بے حجاب

پردہ اٹھادوں اگر چہرۂ افکار سے — لانہ سکیگا فرنگ میری نواؤں کی تاب

۲۴- ڈاکٹر صاحب پر جرمن منکر نٹشے کا بہت اثر تھا، "خودی" کے اسرار ان پر اس وضاحت اور جدت سے فاش نہ ہوتے، اگر نٹشے کی تصانیف سے وہ لاعلم رہتے، بالِ جبریل چھپنے کے کچھ عرصہ بعد ایک دفعہ میں نے ان سے عرض کیا، کہ پچھلے دنوں میں نے نٹشے کی فلاں فلاں کتابوں کو کئی سالوں کے بعد اور شاید تیسری بار پڑھا ہے، لیکن اسکی فکر میں وہ تازگی جوش اور گہرائی ہے کہ ہر بار معلوم ہوتا ہے کہ پہلی بار پڑھ رہا ہوں، اس کے بنیادی خیالات اسلام سے اسقدر

قریب ہیں، کہ افسوس ہوتا ہے کہ کسی نے اس کے سامنے اسلامی نقطۂ نظر پیش نہ کیا، قرآن سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے اسے اپنے فلسفہ میں "انکار الٰہیت" (Godlessness) کی تعلیم دینا پڑی، عیسائیت نے خدا کے بیٹے کو بکری کا تلّا (؟) اور اخلاق کو روحانی پست ہمتی کے مترادف بنا کر اسے صحیح مذہب سے متنفر کر دیا، وغیرہ، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "تمھارا یہ خیال بالکل صحیح ہے، اسی لئے تو میں نے نٹشے کے متعلق کہا ہے کہ ع

دلش مومن، دماغش کافراست،

ڈاکٹر صاحب کی تصانیف میں شاہین کا فقیر و درویش ہونا نٹشے کے زردشت کے اس وعظ سے بہت قریب ہے، جس میں وہ اپنے کوہستانی نشیمن کو اس لئے پسند کرتا ہے، کہ وہاں اسے عقاب اور ستاروں کی ہمسائگی نصیب ہے،

۲۵- ڈاکٹر صاحب سے میں نے دو تین موقعوں پر مرزا بیدل کی شاعری کے متعلق پوچھا، بیدل کے متعلق ان کی رائے نہایت اچھی تھی، میں نے ایک بار کہا کہ اس کی فارسی میں بے ضرورت مشکل پسندی ہے، فرمانے لگے، کہ تھوڑی کاوش سے یہ مشکل دور ہو سکتی ہے، بیدل نے اپنی خاص اصطلاحات وضع کر رکھی ہیں جنھیں وہ اپنے اشعار میں استعمال کرتا ہے، اگر ان اصطلاحات کو پہلے سمجھ لیا جائے تو بیدل میں مشکل باقی نہیں رہتی، بیدل اس قابل ہے کہ اس کا مطالعہ بغور کیا جائے،

۲۶- پچھلے سال اگست یا ستمبر میں ایک روز جب میں شام کے وقت حاضر خدمت ہوا تو آپ حسب معمول جاوید منزل کے صحن میں بستر پر لیٹے تھے، اس سے چند مہینے پہلے ایک دو مرتبہ انھون نے اپنے بچوں کے لئے ایک معلّمہ یا اتالیقہ کی ضرورت کا ذکر کیا تھا، کچھ دیر سیاسی خبروں کے متعلق باتیں ہوتی رہیں، اس دوران میں ایک یورپین خاتون بچوں کو لیکر گذرین میرے

دریافت کرنے پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، کہ یہ خاتون بچون کی اتالیقہ ہیں، جرمن نسل سے ہیں، اور نہایت
شریف الطبع ہین انھیں ہر وقت بچوں کی پرورش کا خیال رہتا ہے، اور فرصت کا کوئی وقت بھی
وہ بے کار نہیں گذارتین، کچھ کام نہ ہو تو کمرہ ہی جھاڑنا شروع کر دیتی ہیں، چنانچہ بچوں کی طرف
سے تو میری طبیعت اب بالکل مطمئن ہے، البتہ مجھے کچھ عرصہ سے تنہائی بہت محسوس ہو رہی ہے،
علی بخش میری ضروریات کی نگہداشت کرتا ہے، لیکن میرے لئے اب زیادہ توجہ کی ضرورت ہے،
صبح سے دوپہر تک کا وقت اچھا گذرتا ہے، لوگ آتے جاتے رہتے ہیں، شام کا وقت بھی اسی
طرح گذرتا ہے، البتہ دوپہر سے چار بجے تک کا وقت سخت تکلیف دہ ہوتا ہے، پڑھنا بند ہو چکا
ہے، اور سوئے انسان کب تک، میں نے عرض کی کہ موسیقی کا انتظام ہو جائے تو طبیعت کو تسکین
ہو گی، فرمایا کہ مجھے موسیقی کی بہت خواہش ہے، میری طبیعت بھی اس کی طرف مائل ہے،
لیکن افسوس ہے کہ ہندوستانی موسیقی بہت الم انگیز اور پژمردہ ہے، جس موسیقی کی مجھے ضرورت
ہے، وہ ابھی شروع نہیں ہوئی،

ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال کہ ہندوستانی موسیقی میں المیت کا عنصر بہت غالب ہے، اور ذوقِ
حیات اس سے پیدا ہو ہی نہیں سکتا، میں نے کئی بار ان کی زبان سے سُنا، اس نتیجہ پر وہ برسون
پہلے پہونچ چکے تھے،

۲۷۔ ۱۹۳۷ء میں سید سر راس مسعود مرحوم کی وفات کی خبر اخباروں میں نکلی، اس کے
چند روز بعد مجھے ڈاکٹر صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا، مجھے معلوم تھا کہ مرحوم ان کو بہت عزیز تھے، چنانچہ
جب مین نے ان کی خدمت میں اظہار افسوس کیا تو انھوں نے مرحوم کی بہت تعریف کی، میں نے
پوچھا کہ مرحوم میں خاص خوبیان کیا تھیں، فرمانے لگے کہ "دو باتین ان میں نمایاں تھیں، ایک یہ کہ وہ
بیحد فیاض تھے، ہر کسی کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے، کسی کی تنگدستی کو برداشت نہ کرسکتے

تھے، اسی لئے ان کی تنخواہ (اگرچہ معقول تھی،) ان کے لئے کافی نہ تھی، کوئی سائل ان کے گھر سے خالی نہ جاتا
تھا، میں تمھیں ایک مثال دیتا ہوں، ان کی بیماری سے کچھ عرصہ پہلے میں نے انھیں لکھا کہ میں نے اپنی وصیت
میں چار اشخاص کو اپنے بچوں کا سربراہ مقرر کیا تھا، ان میں سے ایک صاحب فوت ہو گئے ہیں، مجھے
بہت خوشی ہو گی، اگر آپ سربراہ بننا منظور فرمائیں، انھون نے جواب میں لکھا کہ میں لاہور سے بہت دور
ہوں، اس لئے بحیثیت سربراہ میں بچون کو کیا فائدہ پہونچا سکوں گا، البتہ آپ براہ مہربانی اپنی وصیت مین
یہ الفاظ ضرور درج فرمائیں کہ اگر بچوں کو خدانخواستہ کبھی مالی تکلیف ہو تو سب سے پہلے اطلاع کا حقدار
مجھے سمجھا جائے، دوسری نمایان خصوصیت مرحوم میں یہ تھی، کہ ان کا دسترخوان بہت فراخ تھا، اور ان کا
کھانا بہترین، ان کے پاس بہترین باورچی ملازم تھے، اور عمدہ کھانوں اور ضیافتون پر وہ بے دریغ خرچ
کرتے تھے، چنانچہ انھوں نے اسی غرض سے خالص عربی میزبانی کا سامان مکمل جمع کیا تھا، الغرض مرحوم
ہندوستان کے خوش وضع اور مخیر اکابر میں سے تھے اب ان کا جانشین یا ثانی مشکل سے ملیگا!"

۴۸۔ ڈاکٹر صاحب سے میری آخری ملاقات اخیر دسمبر ۱۹۳۷ء میں ہوئی، اس وقت وہ خوابگاہ
میں پلنگ پر بیٹھے تھے، کچھ دیر تک وہیں باتیں ہوتی رہیں، پھر علی بخش نے آکر اطلاع دی، کہ کھانا تیار
ہے، (دوپہر کا وقت تھا) فرمانے لگے، چلو دوسرے کمرہ میں بیٹھین، ڈاکٹر صاحب صوفا پر بیٹھ گئے، علی بخش
نے کرسی سامنے رکھدی، اور کھانا اس پر چن دیا، میں کھانا کھا کر گیا تھا، اس لئے قریب ہی دوسری کرسی
پر بیٹھ گیا، آپ اشتہا سے کھانا کھاتے رہے، اور باتیں بھی ہوتی رہیں، اتنے میں رحما (دوسرا ملازم) اندر
آیا، اور اطلاع دی کہ مسٹر یوسف علی اور چھوٹے میان (نواب سر ذوالفقار علی خانصاحب مرحوم کے
صاحبزادے) آئے ہیں، آپ نے فرمایا یہیں بلالو، چنانچہ کرسیاں قریب ہی رکھدی گئیں، اور دونون صاحب
اندر تشریف لائے، مسٹر یوسف علی نے سلام علیک کے بعد مزاج پرسی کی، ڈاکٹر صاحب نے حسب عادت فرمایا
بہت اچھا ہون، مسٹر یوسف علی نے فرمایا، میرا بھی یہ خیال ہے، کیونکہ کھانا کھانا خود صحت کی نشانی ہے،

ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں، ڈاکٹر صاحب نے پوچھا، بتائیے انگلستان سے کیسے آمد ہوئی، یوسف علی صاحب نے جواب دیا، کہ قرآن کریم کے آخری تین پاروں کا ترجمہ زیر طبع ہے، یہ کام اپنی نگرانی میں کروانے کے لئے آیا ہوں، کسی بات پر آپ نے مسٹر یوسف علی کو ایک لطیفہ سنایا، (جو میں بھول گیا اس میں وہابیوں کی "بوست" کا ذکر تھا) میں مسٹر یوسف علی کے سامنے بیٹھا تھا، لیکن غالباً وہ مجھے پوری طرح سے پہچان نہ سکے، ڈاکٹر صاحب نے ان سے کہا آپ پروفیسر حمید کو پہچانتے ہیں؟ اسلامیہ کالج میں دو سال آپ کے ماتحت کام کرچکے ہیں، مسٹر یوسف علی بولے ہاں، ہاں، بعد میں تمھیں گجرات میں بھی تو دیکھا تھا، لیکن بھئی تم نے اپنے بال کیوں اس قدر سفید کر رکھے ہیں،؟ میں نے عرض کی کہ خاندانی رجحان سفید بالوں کی طرف زیادہ ہے، ڈاکٹر صاحب نے مسٹر یوسف علی کی طرف مڑ کر کہا، آپ کی صحت پہلے سے بہت اچھی ہے، وہ بولے پہلے (اسلامیہ کالج میں) میں غلام تھا، آج کل آزاد ہوں، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "نہیں، بلکہ بات یہ ہے کہ ان کے لئے (میری طرف اشارہ کرکے) زمان(ہ) Time کی رو آگے کی طرف بہ رہی ہے، اور آپ کے لئے پیچھے کی طرف (Time is moving for words for the professor and backwards for you)

اس کے بعد حسب ذیل باتیں ہوئیں،

یوسف علی صاحب۔ فرمائیے آجکل کچھ زیر تصنیف ہے،؟

ڈاکٹر صاحب:۔ اردو اور فارسی دونوں میں کچھ کلام جمع ہو رہا ہے،

یوسف علی صاحب:۔ آپ کو میرے ساتھ وہ وعدہ یاد ہے، کہ آئندہ فارسی چھوڑ کر اردو کی طرف دوبارہ متوجہ ہوں گا،

میں:۔ بانگ درا کے بعد ڈاکٹر صاحب کی دو اور کتابیں اردو میں شائع ہو چکی ہیں

ڈاکٹر صاحب جی ہاں میں اردو میں چند ساقی نامے لکھ رہا ہوں،

یوسف علی صاحب:۔ موجودہ تصنیف کب مکمل ہوگی؟

ڈاکٹر صاحب:۔ اگلے سال انشاء اللہ مدینہ منورہ میں پہنچ کر،

یوسف علی صاحب:۔ آیندہ سال حج کو ضرور تشریف لے جائیے گا،؟

ڈاکٹر صاحب:۔ جی ہاں ارادہ تو یہی ہے، اطالوی کونسل جنرل نے مجھے دعوت دی ہے کہ اطالوی کمپنی لائڈ ٹریسٹینو کے کسی جہاز میں سفر کیجئے گا، یہ جہاز جدہ میں تو نہیں ٹھہرتے، لیکن جدہ کے سامنے اطالوی سمالی بندرگاہ پر ٹھہرتے ہیں، وہاں سے وہ میرے لئے ایک خاص اگن بوٹ کا انتظام کرنے کا وعدہ کرتے ہیں، جو مجھے جدہ پہنچا دیگی، اس طرح سفر میں مجھے تکلیف نہ ہوگی، اسکے متعلق خط و کتابت جاری ہے،

یوسف علی صاحب:۔ بلاشبہ، اطالوی حکومت کو اسلامی دنیا میں اپنی اہمیت کا پورا علم ہوگا اور وہ ہر طرح سے اسکو سہولت پہنچانے کی کوشش کرے گی،

ڈاکٹر صاحب:۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ سفر کی کوفت سے بچوں، صحت کی موجودہ حالت میں اس کوفت کو برداشت نہ کرسکوں گا،

چند منٹ اور گفتگو ہوئی، اس کے بعد دونوں صاحب تشریف لے گئے، اس ملاقات سے پہلے بھی ایک دو بار مجھ سے ڈاکٹر صاحب نے سفر حجاز کے متعلق اس تجویز کا ذکر کیا تھا، انھیں حج کی اس قدر لو لگی تھی، کہ غالباً انتقال کے وقت انھیں اسی ایک آرزو کے پورا نہ ہونے کا رنج رہا ہوگا،

دس پندرہ منٹ کے بعد میں بھی اجازت لے کر رخصت ہوا اس وقت میرے دل میں یہ خیال ہرگز نہ آسکتا تھا کہ چار مہینہ میں کے قلیل عرصہ میں ڈاکٹر صاحب اپنے عقیدت مندوں کو داغ مفارقت دے جائیں گے اس وقت ان کے چہرہ سے صحت ٹپک رہی تھی، خط تھوڑی

دیر پہلے بنوا کر بیٹھے تھے، موچھوں کو قدرے تاؤ بھی دے رکھا تھا، چہرہ کی شان جرمن جرنیلوں کی سی تھی، طبیعت بہت بشاش تھی، صرف دو تکلیفیں تھیں، ایک آواز جو کسی طرح کھلتی نہ تھی، اور دوسرے موتیا بند جو کچھ عرصہ سے اتر آیا تھا، آواز کے نہ کھلنے کا انھوں نے کبھی گلہ نہ کیا تھا، اور موتیا بند کا وہ مارچ ۱۹۳۸ء میں اپریشن کرانا چاہتے تھے، ان کی شکل وہیئت سے کوئی ایسے آثار ظاہر نہ تھے، جن سے میرے یا اور کسی شخص کے دل میں یہ وہم پیدا ہوتا، کہ خودی کا یہ دانائے راز سفر آخرت کے لئے تیار بیٹھا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ایرانی مطبوعات

تتمہ ثعالبی المتوفی ۴۲۹ھ کی مشہور تصنیف یتیمۃ الدہر جو عربی شعراء اور ادباء کا قدیم تذکرہ ہے، نہایت مشہور و معروف کتاب ہے، مصنف نے بیس برس کے بعد اس کا تکملہ خود لکھا تھا، جو اب ایران میں دو جلدوں میں ٹائپ میں چھپا ہے، قیمت جلد اول للعہ قیمت جلد ثانی للعہ

التوسل الی الترسل بہاء الدین محمد بن موید بغدادی نے جو چھٹی صدی ہجری میں علاء الدین تکش خوارزمشاہ کا میر منشی تھا، جو سرکاری مراسلے فارسی میں لکھے تھے، ان کا یہ مجموعہ ہے، اسمیں بہت سی تاریخی باتیں بھی ضمناً آگئی ہیں، ضخامت ۳۸۵ صفحے قیمت :- سے

تجارب السلف ہندو شاہ بن سنجر نخجوانی نے ۷۲۴ھ میں خلفاء اور وزراء کی فارسی تاریخ لکھی ہے، ضخامت ۳۶۰ صفحے، قیمت ہے

معالم العلماء رشید الدین ابو جعفر بن شہر آشوب المتوفی ۵۸۸ھ نے ایک ہزار شیعہ مصنفین اور رجال کے حالات میں یہ کتاب عربی میں لکھی ہے، ضخامت ۱۴۲ صفحے، قیمت سے

حیات سعدی مولانا حالی مرحوم کی مشہور کتاب کا فارسی ترجمہ ضخامت ۱۴۱ صفحے قیمت عہ "منیجر"

آخری سلاطین تیموریہ کا علمی ذوق

از

سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے رفیق دار المصنفین

بہادر شاہ ظفر

(۲)

ظفر کی اخلاقی شاعری گذشتہ صفحات سے معلوم ہوا ہوگا کہ ظفر کی طبیعت پر حزن و ملال کس قدر غالب ہے، مجنون ناکامیوں اور نامرادیون کے ہجوم میں اسکی زندگی محض داغ تمنا اور سراپا آرزو بنکر رہ گئی تھی، ظاہر ہے کہ ایسے حسرت زدہ اور ارمان سوختہ انسان کے دل و دماغ پند و نصیحت کے لئے کسقدر موزوں ہونگے، ظفر نے اس سلسلہ میں جتنے اشعار کہے ہیں، وہ محض ایک فلسفی کے خیالات نہیں ہیں، بلکہ اپنی واردات زندگی سے جو کچھ اس نے محسوس اور اخذ کیا، ان کو اشعار کی سلک میں منسلک کر دیا ہے، وہ الفاظ کے گورکھ دھندوں اور خیالات کے ہنگاموں میں اپنے اور اپنے ناظرین کو گم کرنا نہیں چاہتا ہے، بلکہ سیدھے سادے الفاظ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہے، پیش کر دیتا ہے، اس کی تمام زندگی اور پھر اس کے اشعار آنکھون کے سامنے ہوتے ہین، تو پڑھنے والوں پر ایک خاص قسم کا اثر ہوتا ہے، جو غیر ارادی طور پر دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے،

شاہجہاں اور جہانگیر کا آخری جانشین گویا اپنی سلطنت کی ویرانی کا یہ عبرتناک مرقع کھینچتا ہے،

جہاں ویرانہ ہے پہلے کبھی آباد گھریاں تھے ۔۔۔ شغال اب ہیں جہاں رہتے کبھی بستے بشر یاں تھے

جہان چٹیل ہے میدان اور سراسر ایک خارستان
کبھی یاں قصر و ایواں تھے چمن تھے اور شجریاں تھے

جہان پھرتے بگولے ہیں اڑاتے خاک صحرا میں
کبھی اڑتی تھی دولت رقص کرتے سیمبریاں تھے

جہان ہیں سنگ ریزے تھے یہاں یاقوت کے تودے
جہان کنکر پڑے ہیں اب کبھی رُلتے گُہریاں تھے

جہان سنسان اب جنگل ہے اور ہے شہر خاموشاں
کبھی کیا کیا تھے ہنگامے یہاں اور شور و شریاں تھے

جہان اب خاک پر ہے نقش پائے آہوئے صحرا
کبھی محو تماشا دیدۂ اہل نظریاں تھے

ظفر احوال عالم کا کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے،
کہ کیا کیا رنگ اب ہیں، اور کیا کیا پیشتر یاں تھے

اس ماتم میں دنیا کی بے ثباتی کا پورا نقشہ ہے، ظفر کی زندگی اور اس کا المناک خاتمہ کچھ ایسا تھا کہ وہی دنیا کی بے ثباتی کی مکمل اور پر درد تصویر کھینچ سکتا تھا، ایک جگہ کہتا ہے،

صحنِ گلشن میں صبا تیرا اگر ہووے گذر،
کہیو بلبل سے ذرا اتنا کہ اے شوریدہ سر

کر رہی ہے چہچے کیا شاخِ گل پر بیٹھکر،
یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں جانور

اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائینگے

یہ تو شعر و شاعری کی زبان تھی، مگر اسی کو صاف صاف ایک پوری غزل میں دوسری جگہ بیان کرتا ہے،

جو تماشا دیکھنے دنیا میں تھے آئے ہوئے
کچھ نہ دیکھا پھر چلے آخر وہ پچھتائے ہوئے

فرش مخمل پر بھی مشکل سے جنھیں آتا تھا خواب
خاک پر سوتے ہیں اب وہ پانوں پھیلائے ہوئے

جو مہیائے فنا ہستی میں ہیں مثل حباب
ہوتے ہیں اوّل ہی سے پیدا وہ کفنائے ہوئے

غنچے کہتے ہیں کہ ہوگا دیکھئے کیا اپنا رنگ
جب چمن میں دیکھتے ہیں پھول کھلائے ہوئے

غافلو اس اپنی ہستی پر کہ ہے نقش بر آب
موج کے مانند کیوں پھرتے ہو بل کھائے ہوئے

اسی لئے وہ دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں کو عبث اور ہیچ سمجھتا ہے، اس کی زندگی اور اس کی زندگی کی تمام نیرنگیاں عبرت کا پیام تھیں، ایک عظیم الشان سلطنت کی بیخ کنی، اوسکی نظروں کے سامنے ہو رہی تھی، ایک پر جلال، پر ہیبت اور پر شکوہ خاندان کے خدم و حشم، عز و شان، اور سطوت و جبروت کا خاتمہ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، تختِ طاؤس پر بیٹھنے والوں کا جانشین، ہمالیہ سے راسکماری تک کے فاتح کا وارث، اور کوڑیوں کی طرح زر و جواہر لٹانے والے کی یادگار، چند روپیوں کے محتاج ہو رہی تھی، ایسی حالت میں دل اور جگر کے زخموں کی ٹپک سے یہ دردانگیز چیخیں کیوں نہیں نکلتیں کہ

سب کارِ جہاں ہیچ ہے سب کارِ جہاں ہیچ
اس ہیچ سے امید ہے اے ہیچداں ہیچ

مانندِ حباب ایک نفس میں ہے خرابی
اس منزلِ فانی میں ہے بنیادِ مکاں ہیچ

اک عمر ہے مایۂ دنیا سے گراں بار
آخر کو جو دیکھا تو بجز بارِ گراں ہیچ

اس باغ میں تھوڑی سی بہار اور پھر آہ
اے نو گلِ خنداں مجھے تشویشِ خزاں ہیچ

ہو جنسِ تنک مایۂ ہستی کے نہ خواہاں
یہ جنس یہ بازار یہ گوہر یہ دکاں ہیچ

آواز طرب گوشِ دل محو فنا سے،
جز نالہ و فریاد و بجز آہ و فغاں ہیچ

پایا نہ بجز داغِ سیہ کاری یک عمر
نقشِ قدمِ قافلۂ عمر رواں ہیچ

کیا دیکھیں ظفر خانۂ ہستی کا تماشہ
اس وہم کدہ میں بجز وہم و گماں ہیچ

مگر ظفر جانتا تھا، کہ اس کی اور اس کے خاندان کی زندگی کی داستان خواہ کیسی ہی دردناک اور عبرتناک ہو، وہ انسانیت کی دنیا میں گنہگار اور مجرم ہوگا، اگر وہ لوگوں کے لئے صرف الم و یاس اور حسرت و حرمان کا پیام چھوڑ جائے گا، وہ اس سے واقف تھا، کہ زمانہ انقلاب آفرین ہے، اس دنیا میں، ؛ ۔

نہ دائم غم ہے نے عشرت کبھی یوں ہے کبھی ووں ہے — تبدل یاں ہے ہر ساعت کبھی یوں ہے کبھی ووں ہے

کوئی دن ہے بہار گل پھر آخر ہے خزاں بالکل — چمن ہے منزل عبرت کبھی یوں ہے کبھی ووں ہے

اسی لئے اس کا پیام ہے، کہ فلک کے تمام مظالم کے باوجود انسان کی ہمت مردانہ کا اقتضا یہ ہے کہ ضبط و صبر سے کام لے اور خدا پر بھروسہ کرے کہتا ہے،

ستم کرتا ہے بے مہری کو کیا کیا آسمان ہمدم — دل اس کے ہاتھ سے پر درد ہے اور چشم ہے پرنم

کروں کا پر نہ شکوہ گرچہ ہوں گے لاکھ غم پر غم — کہے جاؤں گا میں ہر دم یہی جبتک ہے دم میں دم

خدا دارم چہ غم دارم خدا دارم چہ غم دارم

اور جب انسان خدا پر بھروسہ اور توکل کرنے لگتا ہے، تو پھر دنیا کے تمام لوگوں سے مستغنی اور بے نیاز ہو جاتا ہے،

بلا سے گر نہیں کوئی رفیق و آشنا میرا — خدا پر دھیان ہے میرا نگہبان ہے خدا میرا

خدا آسان کریگا گو ہے مشکل مدعا میرا — خدا حامی ہے میرا اور خدا مشکل کشا میرا۔

خدا دارم چہ غم دارم خدا دارم چہ غم دارم

مگر ظفر کا خدا پر بھروسہ کرنے سے مطلب ہرگز یہ نہ تھا، کہ انسان اپنی زندگی کو خود سنوارنے کی کوشش نہ کرے، ظفر جانتا تھا کہ انسان کو اسی دنیا میں زندگی بسر کرنا ہے، وہ اپنے لئے کوئی نیا عالم اور نیا آسمان پیدا نہیں کر سکتا ہے، مگر ہاں اس کے لئے خوشگوار راہیں کھلی ہوئی ہیں جن پر چل کر وہ اس دنیا میں مسرت و راحت کی زندگی گذار سکتا ہے، وہ کونسا راستہ ہے ملاحظہ ہو،

اتنا نہ اپنے جامے سے باہر نکل کے چل — دنیا ہے چل چلاؤ کا رستہ سنبھل کے چل

نخوت، پندار، تکبر اور غرور کی راہ میں صرف تباہیاں اور بربادیاں ہیں، اس لئے

کم ظرف پر غرور ذرا اپنا ظرف دیکھ — مانند جوش خم نہ زیادہ ابل کے چل

فرصت ہے اک صدا کی یہاں سوز دل کے ساتھ — اس پر سپند وار نہ اتنا اچھل کے چل،

اس دنیا میں قدم قدم پر مکر و فریب کا جال ہے، ہوش و خرد کا تقاضا ہے، کہ انسان ان سے دامن بچا کر زندگی کی مشکل راہوں کو طے کرے،

یہ غول وش ہیں انکو سمجھ تو نہ رہنما — سایہ سے بچ کے اہل فریب و دغل کے چل

مگر اس کے باوجود انسان کی زندگی کی منزلیں اسی وقت طے ہو سکتی ہیں، جب وہ خود اپنے پاؤں سے چلے، اور اسکو اپنے بازو کی قوت پر اعتماد ہو،

اوروں کے بل پہ بل نہ کر اتنا نہ چل نکل — بل ہے تو بل کے بل پہ تو اپنے بل کے چل

اور اسکے ساتھ ہی آنکھوں میں بصیرت کا نور چاہئے، کہ اندھیری راہ گم نہ کر سکے،

پھر آنکھیں بھی دی ہیں کہ رکھ دیکھ کر قدم — کہتا ہے کون تجھکو نہ چل چل سنبھل کے چل

لیکن انسان کو اپنی تمام جدوجہد اور سعی و کوشش کے باوجود کارکنان قضا و قدر ہی کا بہرحال محتاج رہنا ہے،

انساں کو کل کا پتلا بنایا ہے اس نے آپ — اور آپ ہی وہ کہتا ہے پتلے کو کل کے چل

ظفر زندگی کے مسائل کو یہیں پر ختم نہیں کر دینا چاہتا ہے، بلکہ اس نے ایک عالمگیر لطف و کرم کا بھی پیام دیا ہے، جس کے ذریعہ سے اس کا خیال ہے کہ انسان نہ صرف اپنے کو اوصاف حمیدہ اور اخلاق حسنہ سے متصف کر سکتا ہے، بلکہ وہ کائنات کی تمام چیزوں کو اپنے قابو میں لا سکتا ہے، ایک الہامی شاعر بن کر کہتا ہے،

گوش دل میں مرے آئی سحر آواز سروش — کہ کسی یار کے شکوہ سے نہ کر کچھ تو خروش

گر کہیں یار برا لطف سے ہو تو ہو خاموش — یار عیار ہے تو پھر یار ہے ای صاحب ہوش

لطف کن لطف کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش

پھر لطف کی سحرآفرینیوں پر رقمطراز ہے،

لطف سے وحشی صحرا ہی نہیں تنہا رام — لطف سے ماہی و مرغ آئے حلقۂ دام

لطف سے بنتے ہیں انساں ہی فقط کیا خدام — لطف سے ہوئے پرستار پری دیو غلام

لطف کن لطف کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش

لطف سے کن کے ہوئے کہتے ہی دونوں عالم — لطف سے روح ہوئی داخلِ جسم آدم،

لطف سے گرچہ ہو معشوق بھرے عشق کا دم — لطف سے غیر بنے بندۂ بے دام و درم

لطف کن لطف کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش

آگے چل کر جو شاعرانہ انداز سے گل افشانیاں کی ہیں ان میں دقتِ نظر کیساتھ زور بیان بھی [illegible]

حلقۂ موجِ ہوا توسِ قزح توسِ ہلال — گردشِ چرخِ بریں گردشِ مہ گردشِ سال

گردشِ ساغرِ مے گردشِ فانوسِ خیال — سب تجھے کہتے ہیں یہ حلقہ بگوشوں کی مثال

لطف کن لطف کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش

اسی طرح بعض جستہ جستہ ناصحانہ خیالات دیوان میں بہت کچھ ملیں گے، مثلاً

ظفر آدمی اس کو نہ جانئے گا وہ ہو کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا

جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

عقل پر ناز ہے قدرت پر نظر کسکو ہے — سب کو فکر آج کی ہے کل کی خبر کس کو ہے

فنا ہی ساتھ تو پھر زندگی سے کیا حاصل — فنا سے پہلے فنا ہو کہ ہو بقا حاصل

جو دل کو صاف ہو کرنا تو خاکساری کر — کرے ہے خاک سے دیکھ آئینہ صفا حاصل

خاک کا پتلا ہے انسان او ظفر اس کیلئے — سرکشی اچھی نہیں ہے خاکساری کیلئے

جب کوئی کہتا ہے ہستی کو کہ ہستی خوب ہے — اسکی غفلت پر فنا اس وقت ہنستی خوب ہے

دنیا کا ہے مزا ظفر انجام کار زہر — میٹھا سمجھ کے لوگ اسے للچا گئے تو ہیں

اے ظفر چاہئے بندہ کو گنہ سے پرہیز — ورنہ کچھ تنگ نہیں غفار کی غفاری میں

گلشن دنیا نہیں جائے قیام اے غافلو — غنچہ ساں تم دوش پر رختِ سفر باندھے رہو

جو کہ ہے قسمت میں ہونا ہوگا آخر کو وہی — اے ظفر کیا شکوہ اس کا یوں ہوا یا ووں ہوا

برے ہیں یا بھلے ہم تم ظفر لیکن غنیمت ہیں — کہ یاد آئیں گے پھر پھر کر نہ ہم جیسے نہ تم جیسے

دنیا سے جس نے کھینچ لیا ہاتھ اے ظفر — پھیلائے پاؤں کیوں نہ ہو کنجِ فراغ میں

آدمی کو چاہئے آدم شناسی اے ظفر — ہے یہ فرمودہ ہمارے حضرت تیمور کا

منعم اس دولت دنیا پر نہ کر دیکھ غرور — سیکڑوں گور میں کیا کیا نہیں بہرام دبے

ظفر کی صوفیانہ شاعری

یہی ناصحانہ خیالات آگے چل کر صوفیانہ خیالات میں تبدیل ہو گئے ہیں، حوادث زمانہ اور وارداتِ زندگی نے ظفر کے دل میں اپنے مالکِ حقیقی کی لگن ایسی پیدا کر دی تھی، کہ آخر میں وہ بادشاہِ وقت ہونے کے بجائے ایک صوفی منش فقیر ہو گیا تھا، اس کی زندگی صبر، توکل، اور استغنا، کی داستان ہے، طبیعت میں فقر و درویشی کا خمیر موجود تھا، ہجومِ مصائب نے اس نشہ کو اور تیز کر دیا، عہد طفلی ہی میں مولانا فخر الدینؒ سے شرف بیعت حاصل کی، چنانچہ خود کہتا ہے،

مرشد پاک رواں فخر الدین، — قبلہ و کعبۂ جان فخر الدین،

اک جہان فخر جہاں کہتا ہے — پر ہے فخر دو جہاں فخر الدین،

میں گدا ہوں ترے دروازے کا — جاؤں اس در سے کہاں فخر الدین

موجزن ہے ترا دریائے کرم — از کراں تا بہ کراں فخر الدین

ہے مدد تیری توانائی بخش — میں ہوں بے تاب و تواں فخر الدین

کیا کروں عرض عیاں ہے تجھ پر — میرا سب راز نہاں فخر الدین

رکھ ظفر ہر نفس و ہر ساعت ، شغل دل ورد زباں فخر الدین

ایک جگہ اور کہتا ہے،

کیا خطر اس کو راہ دیں میں ظفر رہنما جس کا فخر دین ہو جائے،

ایک دوسری جگہ لکھتا ہے[1]

اے ظفر میں کیا بتاؤں تجھ سے جو کچھ ہوں سو ہوں لیکن اپنے فخر دین کے کفش برداروں میں ہوں

ظفر کو اس خاندان سے کچھ ایسی شیفتگی تھی، کہ مولانا فخر الدین رح کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے مولینا قطب الدین رح سے بیعت لی، خود رقمطراز ہے،

مرید قطب دین ہوں خاکپاے فخر دیں ہوں میں • گرچہ شاہ ہوں ان کا غلام کمترین ہوں میں

ان ہی کے فیض سے ہے نام روشن میرا عالم میں وگرنہ یوں تو بالکل روسیہ مثل نگیں ہوں میں

نہ کعبہ سے غرض مجھ کو نہ میخانہ سے کچھ مطلب ہمیشہ گھستا ان کے آستانے پر جبیں ہوں میں

[1] اس عقیدت کا اظہار اپنے دیوان میں متعدد بار کیا ہے، مثلاً

خاک پاے فخر دیں ہے اپنے حق میں کیمیا اے ظفر کیوں خواہش اکسیر کرنی چاہیے

کہتا ہے ظفر جو کچھ اب جوش محبت میں اے فخر جہاں سب وہ تیری ہی عنایت ہے

جو خاک بھی ہوں تو ہوں فخر دین کے در کی ظفر چھوڑائے نہ مجھ سے اس آستاں کو چرخ

اللہ اللہ جلوۂ حسن و جمال فخر دیں ہے اسی پر اے ظفر گرویدہ دل گرویدہ آنکھ

مدد اے فخر جہاں تا ہوں ظفر کے دل میں سب ملال آپ کے الطاف و عنایات میں رفع

ظفر دشوار ہے ہر چند اہل معرفت ہونا مگر صدقے میں فخر الدیں کے ہاں ہو سکتا ہے سب تجھے

جس کا ہے سرمہ ظفر خاک در فخر الدین چشم بد دور وہ ہے ، اور ہی تاثیر کی آنکھ

کوچۂ فخر جہاں کی اے ظفر ، خاک کی چٹکی بھی بس اکسیر ہے،

رہوں میں رند میکش پر رہوں انکی محبت میں نہیں خواہش مجھے یہ صوفی خلوت نشیں ہوں میں

مجھے تو خانقاہ و میکدہ دونوں برابر ہیں، ولیکن یہ تمنا ہے کہ ان کا ہوں کہیں ہوں میں

یہی عقدہ کشا میرے یہی ہیں رہنما میرے سمجھتا ان کو اپنا حامی دنیا و دیں ہوں میں

بہادر شاہ میرا نام ہے مشہور عالم میں ولیکن اے ظفر ان کا گدائے رہ نشیں ہوں میں

اور جب مولینا قطب الدین کا وصال ہوا تو ان کے صاحبزادے غلام نصیر الدین عرف کالے صاحب سے وہی جوش عقیدت اور قلبی تعلق قائم رکھا، حالانکہ موخرالذکر اپنے والد کے انتقال کے وقت محض خورد سال تھے، ظفر نے ان کی طرف سے اپنے احساسات کا اظہار اس طرح کیا ہے،

نظام خانۂ فخر جہاں تمہیں تو ہو • قیام سلسلہ و خاندان تمہیں تو ہو،

نہ کیونکر تم سے ہوں ظاہر صفات قطب دین خدا رکھے تمہیں ان کا نشاں تمہیں تو ہو،

تمہارے در پہ جھکا کر سر ارادت خلق کہے ہے کعبۂ امن و اماں تمہیں تو ہو،

نثار تم پہ ہیں پروانہ ساں ہزاروں دل کہ شمع محفل صاحبدلاں تمہیں تو ہو

تمہاری قوت باطن سے تقویت ہے مجھے کہ میری باعث تاب و تواں تمہیں تو ہو،

بغیر آپ کے ہوں کیوں نہ جان و دل بے چین کہ راحت دل و آرام جاں تمہیں تو ہو

ظفر کی چاہیے نصرت تمہیں نصیر الدین کہ اس کے یار و مددگار تمہیں تو ہو،

ظفر کو نہ صرف اپنے مرشدوں سے یہ ارادت و عقیدت تھی، بلکہ باکمال صوفیاے کرام سے بھی یہی عقیدتمندانہ غلو تھا حضرت معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں ایک مخمس لکھکر کہتا ہے،

تم ہو اے خواجہ معین سروران حق پرست تم ہو رمز آگاہ کن اور واقف سر الست

تم مددگار ظفر ہو کیوں ظفر کو ہو شکست پر فلک کی دیکھ گردش کانپتے ہیں پاؤں دست

یا معین الدین چشتی دستگیری لازم است

اسی مخمس میں آگے چل کر لکھتا ہے،

خاک پر سے جو کہ ہل سکتا نہ ہو جوں نقش پا — تم اٹھاؤ تو وہیں ہو وہ سنبھل کر اٹھ کھڑا

عیسیٰ جان بخش ہو تم اور خضر رہ نما — دردمندوں کی دوا ہو ناتوانوں کے عصا

یا معین الدین چشتی دستگیری لازم است

ظفر نے خود اپنے ہاتھوں پر بھی بیعت لینی شروع کی تھی، قلعہ معلیٰ کے لوگ، پھر سرکار کمپنی بہادر کے دیسی سپاہی اس کے حلقہ بگوش تھے، آگے چل کر تصوف کی چاشنی اسقدر بڑھ گئی تھی کہ سعدی کی گلستان کی شرح صوفیانہ نقطۂ نظر سے خود لکھی، اور اشغال واذکار میں ایک کتاب سراج المعرفت نام مفتی میر لال سے لکھوائی[1]

ظفر کی متصوفانہ طبیعت کے اثرات اسکی شاعری سے بھی ظاہر ہیں، لیکن وہ تصوف کا کوئی فلسفی نہیں، اس لئے خیالات اور مسائل کے اظہار میں نہ وہ نکتہ آرائی اور جدت طرازی کرتا ہے اور نہ غالب کی طرح تصوف کے عقدہائے سربستہ کی تحلیل اور تشریح میں دقیق اور نکتہ آفریں الفاظ استعمال کرکے خیالات کو ادق اور مشکل بناتا ہے، بلکہ اپنے قلب کے تاثرات اور احساسات کو سیدھے اور سادے الفاظ میں پیش کر دیتا ہے، جن کو پڑھنے کے بعد مفہوم کو سمجھنے کے لئے غور و فکر کی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی، بلکہ بے اختیارانہ طور پر اس کے اثرات خود بخود دل پر قائم ہوتے جاتے ہیں، اس کی شاعری مادی خیالات سے ملوث ضرور ہے، عشق مجازی کی تمام کیفیتیں بھی اس پر طاری ہیں، لیکن اس عشق مجازی کی شراب سے اس میں عشق

---

[1] یہ معلومات امیر احمد علوی صاحب بی اے کی کتاب بہادر شاہ ظفر سے لی گئی ہیں، بہادر شاہ ظفر کی ایک اور تالیف موسوم بہ "لغت و اصطلاح دکن" تین جلدوں میں ہے، لیکن یہ مفقود ہے، اس کا اشارہ شرح گلستان سعدی کے دیباچہ میں ہے، شرح گلستان ۱۲۵۹ھ میں مطبع سلطانی دہلی سے شائع ہوئی تھی،

حقیقی کا نشہ پیدا ہو جاتا ہے، اور پھر اس نشہ کی سرمستی، بے خودی، اور خود فراموشی اس پر اس قدر غالب آجاتی ہے، کہ شعر کہتے کہتے خود اس میں گم ہو جاتا ہے، اور بیخود ہو کر کہتا ہے،

مے وحدت کی ہم کو مستی ہے — بت پرستی خدا پرستی ہے،

اس "مۓ وحدت" کے خمار میں اس کو عالم ناسوت کی تمام چیزیں عالم لاہوت میں نظر آتی ہیں، اور ایک وجدانی کیفیت میں تصور کرتا ہے کہ

شعلہ ہو وہی شمع وہی ماہ وہی ہے، — خورشید وہی نور سحرگاہ وہی ہے،

حور و ملک و دیو پری انس و جنی جان — سب صورتوں میں ما ہی دلخواہ وہی ہے،

یوسف ہے وہی ذی زلیخا وہی یعقوب — کنعان ہے وہی مصر وہی چاہ وہی ہے،

رہرو وہی رہبر وہی وہ ہی رہ مقصود — گمراہ وہی راہ سے آگاہ وہی ہے،

کیا حسن میں کیا عشق میں سب میں ہے وہی نور — یہ موجب غمزہ سبب آہ وہی ہے،

مجنون خراباتی و دیوانہ و ہشیار — درویش و گدا شاہ و شہنشاہ وہی ہے،

خارا میں شرر ہے وہ ظفر لعل میں وہ رنگ

واللہ وہی سب میں ہے باللہ وہی ہے

اسی کو اپنی ایک فارسی غزل میں کہتا ہے،

اینکہ بینی ہمہ ہا قالب و جان ہمہ اوست — بلکہ ہم قالب و ہم روح روان ہمہ اوست

انچہ بیرون و درون ست ہمانست ہمان — راز فاش ہمہ او سر نہان ہمہ اوست

در پس پردہ و بے پردہ درآید از دل — بے نشان و سبب نام و نشان ہمہ اوست

نیست دیر و حرم از شیخ و برہمن آباد — ہمہ مہمان و مکینے مکان ہمہ اوست

اے دل آن گوہر یکتا کہ نیرزد بدو کون — چشم بکشا و ببیں زیب دکان ہمہ اوست

شعلۂ نارِ جحیم و گل گلزارِ نعیم، یک تجلی است کہ در جلوۂ شان ہمہ اوست

می زند اے ظفر امروز بباغِ توحید،

ہمچو بلبل دل شوریدہ فغان ہمہ اوست

یہ شاید استاد غالب کے اس سوال کا جواب ہے کہ

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب آخر تو کیا ہے، اے نہیں ہے،

لیکن اس حقیقتِ مستور کا احساس ہوا تو اس کا مشاہدہ بھی ضروری ہے، تصوّف کی راہ میں ایک ایسا مقام بھی آتا ہے، جب کہ طالبِ حقیقت وادی تحیر میں گم ہو کر رہ جاتا ہے،

صفائے حیرت آئینہ ہے سامان زنگ آخر

تغیر آب برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر (غالب)

اور پھر وہ ایسا حیرت زدہ ہو جاتا ہے، کہ ساری حقیقتیں سامنے ہوتی ہیں، لیکن وہ دیکھ نہیں سکتا ہے،

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے

طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے (غالب)

ظفر پر بھی ایسی کیفیت طاری ضرور ہوتی ہے، وہ کہتا ہے،

میں ہوش میں ہوں یارب یا کہ مجھ وحشت ہے گہ جوش ہنسی کا ہے گہ گریہ کی شدت ہے،

مجذوب ہوں یا سالک غافل ہوں کہ دیوانہ کیا جانئے میں کیا ہوں اور کیا میری حالت ہے

پھر کہتا ہے:۔

دکھاتا یار ہے ہر رنگ میں جلوہ ہمیں لیکن کہاں سے لائیں وہ آنکھیں کہ جن آنکھوں سے ہم دیکھیں

مگر وہ مشاہدۂ جمال سے محروم نہیں ہوتا ہے، بلکہ حُسنِ عالم افروز اور جمالِ جہان آرا کو دیکھتا ہے،

گہ شعلہ میں گرمی ہے تو گل میں نزاکت ہے ہر شے میں نظر آتی اللہ کی قدرت ہے،

جلوہ تجھے وہ اپنا ہر شے میں دکھاتا ہے پردہ تری آنکھوں کا پر تیری ہی غفلت ہے،

اور جب وہ دیکھ چکتا ہے تو بے خود اور سرمست ہو کر نعرہ زن ہوتا ہے،

ترا حسن ہم جلوہ گر دیکھتے ہیں، جہاں دیکھتے ہیں جدھر دیکھتے ہیں،

کریں کیونکر دل کی نہ ہم پاسداری کہ ہر دل میں ہم تیرا گھر دیکھتے ہیں،

طالبِ حقیقت جب مطلوب کے دیدار سے شرف اندوز ہوتا ہے، تو اس موقع کی لذت کی کیفیت جو ظفر نے کھینچی ہے، وہ ملاحظہ ہو،

مری آنکھ بند تھی جب تلک وہ نظر میں نورِ جمال تھا کھلی آنکھ تو نہ خبر رہی کہ خواب تھا کہ خیال تھا

کہو اس تصور یار کو کہوں کیوں نہ خضر خجستہ پے کہ یہی تو دشتِ فراق میں مجھے رہنمائے وصال تھا

مرے دل میں تھا کہ کہوں گا میں جو دل پہ رنج و ملال ہے وہ جب آگیا مرے سامنے نہ تو رنج تھا نہ ملال تھا

وہ ہے بے وفا وہ ہے پر جفا وہاں لطف کیسا وفا کہاں فقط اپنا وہم و خیال تھا یہ خیال امر محال تھا

پسِ پردہ سن کے تری صدا ترا شوقِ دید جو بڑھ گیا مجھے اضطراب کمال تھا یہی وجد تھا یہی حال تھا

ظفر اس سے چھٹ کے جو جست کی تو یہ جانا ہم نے کہ واقعی

فقط ایک قید خودی کی تھی نہ قفس تھا کوئی نہ جال تھا،

ظفر اس قرب و وصال کو اہلِ تصوف کی طرح ایک راز ضرور سمجھتا ہے، لیکن اس کا خیال ہے کہ یہ راز ایسا نہیں جو صرف محدود طبقہ ہی کو معلوم ہو سکے، خودی کو مٹا کر جس کسی نے دیدۂ بینا، اور دلِ مصفّا اور پھر سرگرمیٔ جستجو اور جوشِ جنوں پیدا کر لیا، تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس کا دل حقیقت آشنا نہ ہو، کتنے سادے الفاظ میں اوس نے حقیقت کے راز کو ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیا ہے،

جو عرش سے ہے فلک تلک سب کچھ اسی کا ہے دیکھ آنکھ کھول کر،

کیا کیا نہیں ہے آئیں کہ سب کچھ اسی میں ہے
پر چاہیئے نظر

دل اپنا پہلے زنگِ کدورت سے صاف کر
مانندِ آئینہ

پھر تو بغور دیکھ کہ اس آرسی میں ہے
کیا حسن جلوہ گر

پیدا نگاہ کر کہ تجلّی حسنِ یار،
سب جا ہے آشکار

شعلہ سے طور کے نہیں کم روشنی میں ہے
ہر سنگ کا شرر

کیوں کعبہ و کنشت میں سر مارتا ہے تو
سرگرم جستجو

تو جس کو ڈھونڈھتا ہے چھپا وہ تجھی میں ہے
پر تو ہے بے خبر

جوشِ بہارِ حسن سے کس گل کا اے صبا
ہے یہ جنون کا جوش

معروف اسقدر جو گریباں دری میں ہے
ہر غنچہ ہر سحر

ہے دورِ جام و صحبتِ یارانِ زندہ دل
کیفیتِ حباب

کچھ ہے اگر مزا تو یہی زندگی میں ہے
باقی ہے دردِ سر

اے خود پرست پوچھتا کیا ہے خدا کی راہ
ہے وہ بہت قریب

گم کردہ راہ آپ تو اپنی خودی میں ہے
اس سے ہے دور تر

صد داغ سوزِ عشق سے کھا بلکہ صد ہزار
ہر داغ دل پہ تو

لذت تجھے نصیب اگر عاشقی میں ہے
اے سوختہ جگر

افشائے رازِ عشق نہ کر کہکے جی کی بات
پردہ ہی خوب ہے

جی ہی میں اپنے رہنے دے جو کچھ کہ جی میں ہے
خاموش اے ظفر

ظفر کا خیال ہے کہ حقیقت مستور نہیں، ہم اس کو دیکھتے نہیں محض اس لئے کہ ہماری آنکھوں پر خودی اور نفس کا پردہ پڑا ہے، اگر یہ پردہ ہٹ جائے تو تمام رموزِ سربستہ اور اسرارِ پوشیدہ ظاہر

ہو جائیں، اور دل انوارِ الٰہی کا مظہر بن جائے، پھر ہمارے اور خدا کے درمیان کوئی تفاوت باقی نہ رہے، اسی کو واضح کر کے کہتا ہے، ؎

دیا اپنی خودی کو جو ہم نے اٹھا وہ جو پردہ سا بیچ میں تھا نہ رہا
رہے پردے میں اب نہ وہ پردہ نشین کوئی دوسرا اسکے سوا نہ رہا

ایک جگہ اور کہتا ہے،

اگر ہے دیکھنا اس کو اٹھا دے اپنی ہستی کو
اگر تجھ میں اور اس میں پردہ حائل ہے تو بس یہ ہے

پھر کہتا ہے،

ہر جائے ہے قدرت کا تماشا مرے آگے
لیکن مری غفلت کا ہے پردہ مرے آگے

اب اس کے لئے ظفر کے یہاں عرفی کی طرح "شعار ملت اسلامیان" چھوڑنے[1] اور نہ غالب کی طرح رسوم و قیود کے ترک کرنے[2]، اور نہ عام صوفیوں کی طرح حال و قال اور مقام و قیام پر پابند ہونے کی ضرورت ہے، ظفر کے نزدیک تصوف کی راہیں پیچ در پیچ نہیں،

راہیں ہیں دو مجاز و حقیقت ہے جن کا نام
رستے نہیں ہیں عشق کی منزل کے پانچ پانچ

چنانچہ اس کے یہاں انوارِ معرفت حاصل ہوتے ہیں تو اس طرح کہ

پردہ دوئی کا بیچ میں حائل اگر نہ ہو،
کیجے جدھر نگہ وہی پیشِ نگاہ ہے،

(باقی)

[1] عرفی نے کہا ہے:-

شعار ملتِ اسلامیان بگذار اگر خواہی
کہ در دیر مغاں آئی و اسرار نہاں بینی

[2] مرزا غالب کہتے ہیں:-

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایمان ہوگئیں

بنگال کی علمی سعی وجہد

اور

تعلیمی رفتار پر اہم تبصرہ

از

جناب مولینا عبدالرب صاحب ہاشمی سلہٹی (فاضل دیوبند)

"یہ مضمون زمیندار کے بنگال نمبر مین شائع ہوا ہے، مضمون کی اہمیت اس کی مقتضی ہے کہ اس کو مسلمانوں کے زیادہ سے زیادہ حلقہ تک پہنچایا جائے، اس لئے اس کو معارف میں شائع کیا جارہا ہے، یہ اس صوبہ کا حال ہے، جہاں مسلمانوں کی سب سے بڑی آبادی ہے"

(معارف)

ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط ہونے سے قبل صوبہ بنگال کی تعلیمی و اقتصادی حالت جیسی بھی تھی اسے ہمیں بیان کرنے کی ضرورت نہیں، لہذا یہان صرف ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری سے مابعد کے احوال پر بحث ہوگی، نیز بنگال و آسام اگرچہ علحدہ علحدہ دو صوبے ہیں، مگر مغربی آسام یعنی "سورما ویلی" اور بنگال کی تہذیب و تمدن ایک ہی ہے، لہذا لفظ بنگال سے "سورما ویلی" (آسام) اور بنگال دونون سمجھنا چاہئے، بنگال کی تعلیم تین قسموں پر تقسیم کیجا سکتی ہے (۱) بنگلہ تعلیم (۲) انگریزی تعلیم (۳) عربی تعلیم ان میں سے ہر ایک پر علحدہ علحدہ تفصیل سے بحث کیجاتی ہے،

صوبہ بنگال کی بنگلہ تعلیم لفظ بنگلہ کا اطلاق اس وقت تین زبانون پر ہونے لگا ہے، بنگالی بولی، پرانی

بنگلہ، نئی بنگلہ، (یا اصلی بنگلہ لہذا پہلے ان تینون پر تبصرہ ہونا چاہئے، تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو،

بنگالی بولی اکثر ممالک اور خود ہندوستان کے اکثر صوبجات میں یہ دیکھا گیا ہے، کہ جو زبان ان کے روزمرہ کے باہمی معاملات میں مستعمل ہوتی ہے، وہی انکے لکھنے پڑھنے کی زبان بھی ہوتی ہے، اگر بدقسمتی سے یہاں لکھنے پڑھنے کی زبان اور ہے، اور بول چال کی اور پھر بولیوں میں باہم اس قدر اختلاف ہے، کہ شاید ہی کسی اور خطہ میں ہو، ضلع سلہٹ اور ضلع کچھاڑ کی بولی اور ہے اور باقی اضلاع کی اور، اسی طرح میمن سنگہ کی بولی الگ ہے، اور کمرلا اور ڈھاکہ کی الگ الگ، کلکتہ اور ندیا شانتی پور کی بولی ایک اور رنگ اپنے اندر رکھتی ہے، اسی طرح تقریباً تمام اضلاع کی بولیاں الگ الگ نوعیت کی ہین، الگ الگ لب ولہجہ کی ہیں، اور پھر اکثر اضلاع ایسے ہیں، جن مین تین تین چار چار مختلف لب ولہجہ کی بولیان ہیں، مگر اسلام آباد (چاٹگام) اور برما کی بولی، اس طرح ان تمام بولیون سے مختلف اور اجنبی ہے، کہ خود بنگال کے دیگر اضلاع کے باشندے اسے بالکل نہیں سمجھ سکتے، کاتب الحروف کو جب جب ان سے گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے، تو اردو میں یا پرانی بنگلہ مین گفتگو کی ہے،

یہ ضلع وار بولیان لکھنے پڑھنے کی نہیں ہیں، ہان ندیا شانتی پوری بولی کچھ مہذب و شایستہ ہونے کی وجہ سے آج کل تحریر و تقریر میں آنے لگی ہے، بنگال کے بعض مقامات میں اردو بھی بولی جاتی ہے، اور سمجھتے تو ہر جگہ کے لوگ ہیں،

پرانی بنگلہ پرانی بنگلہ کے ساتھ اُس کے نام رکھنے میں بڑا ظلم کیا گیا ہے، اس کا نام "اصلی بنگلہ" ہونا چاہئے تھا، اس لئے کہ یہی وہ زبان ہے، جو ہندو مسلم اتحاد و ملاپ سے پیدا ہوئی تھی، یعنی جس طرح ہندو مسلم ملاپ سے شمالی ہند میں اردو جیسی ہمہ گیر اور فصیح و بلیغ زبان کی بنیاد پڑی تھی، بعینہٖ اسی طرح بنگال میں ہندو مسلم میل جول سے "پرانی بنگلہ" کی بنیاد پڑی تھی، اس کے اکثر الفاظ فارسی اور عربی

کے ہیں، اور باقی سنسکرت کے، یہ زبان نہایت سہل الفہم ہونے کے ساتھ ساتھ فصیح اور بلیغ ہے، اگرچہ اردو کی جیسی سلاست اس میں نہیں ہے، تاہم نئی بنگلہ کی نسبت ہزار گونہ سلاست و روانی اپنے اندر رکھتی ہے، اس میں بڑی بڑی تاریخی، اصلاحی اور اقتصادی کتابیں لکھی گئی ہیں، مگر منثور کی نسبت اکثر تصانیف منظوم ہیں، جو اس قدر دلکش اور پر کیف انداز میں لکھی گئی ہیں، کہ ایک کتاب کو شروع کر لینے کے بعد آخر تک پہنچانے پر انسان مجبور ہوتا ہے، یہ زبان اس قدر عام فہم ہے، کہ معمولی ان پڑھ آدمی بھی صرف حروف کے پہچان لینے کے بعد بآسانی اس میں لکھ پڑھ سکتا ہے اور اس قدر جامع اور ہمہ گیر ہے، کہ پورے بنگال میں وہ سمجھی جاتی اور بولی بھی جاسکتی ہے

نئی بنگلہ (یا اصلی بنگلہ) جس بنگلہ زبان کو ہمارے ہندوستانی اصلی بنگلہ کہتے ہیں، اور اسکولوں میں جس کی تعلیم دیجاتی ہے، وہ اصل میں سنسکرت کی اولاد میں اس کی "سب سے بڑی صاحبزادی" ہے، مگر سخت و دشوار ہونے میں یہ کسی طرح بھی اپنی مادر محترمہ سے کم نہیں، نیز جس طرح سنسکرت دنیا کے کسی خطہ کی انسانی بولی نہیں ہے، ٹھیک اسی طرح بنگلہ بھی بنگال کے کسی علاقہ میں روزمرہ کے باہمی معاملات اور گفتگو میں استعمال نہیں کیجاتی، صرف اسکولوں کی چار دیواریوں کے اندر اور پنڈتوں کی پوتھی میں پائی جاتی ہے، اور اس کا صحیح اندازہ اس وقت ہوسکتا ہے، کہ جب کوئی لیکچرار صاحب کسی پبلک جلسہ یا جلوس میں بزبان نئی بنگلہ تقریر کرتے ہوتے ہیں، تو خدا جانتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شمالی ہند کے کسی کانگریسی جلسہ میں کوئی مہا بھائی ہندو تقریر کر رہا ہے اور بلا لحاظ ترتیب الفاظ و ترتیب معانی سنسکرت کے بے جوڑ الفاظ تقریر کے درمیان میں ٹھوس رہا ہو، اور سامعین خواہ مخواہ اسے تبرک سمجھ کر سُن رہے ہیں، اور دل کو یہ کہکر تسلی دے رہے ہیں کہ تقریر تو آخر آزادی ہندی پر ہوگی،

اب جب کہ تینوں زبانوں کا حال قدرے معلوم ہوگیا، تو اس کی تعلیم کی طرف رجوع کرنا

چاہئے، انگریزوں نے جب بنگال میں انگریزی تعلیم کیساتھ بنگال کی مادری زبان میں بھی تعلیم دینے کو منظور کیا، اور ابتدائی تعلیم کے لئے چار سال کا نصاب اور اعلیٰ تعلیم کے لئے چار سال یا تین سال کا نصاب مقرر ہوا، تو چونکہ صوبۂ بنگال کی مادری زبان یعنی "بنگالی بولی" لکھنے پڑھنے کی زبان نہ ہونے کیساتھ ساتھ ہمہ گیر و جامع بھی نہیں تھی، لہٰذا پرانی بنگلہ ہی کو یہ شرف نصیب ہونا چاہئے تھا، اس لئے کہ یہی ہندو مسلم مشترکہ زبان ہے، اور اسکولوں میں جیسے ہندوؤں کے بچے تعلیم پائیں گے ویسے مسلمان بچے بھی تعلیم پائیں گے، بلکہ مسلمانوں کی اکثریت ہونے کی وجہ سے مسلم بچوں کی بھی اکثریت ہوگی، مگر ایک طرف انگریزوں کی ہندو نواز پالیسی تھی، کہ وہ پاٹ شالے جو مدتوں سے صرف ہندوؤں کی خالص مذہبی درسگاہیں تھیں، اور جن میں صرف سنسکرت کی مذہبی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، ان کو ہندو مسلم مشترکہ درسگاہیں بنانا شروع کر دیا اور ہندوؤں نے بھی اسکو نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر اپنے مذہبی پاٹ شالوں کو سرکاری پاٹ شالوں میں تبدیل کرانا شروع کر دیا،

دوسری طرف کچھ مسلمانوں کی بے توجہی تھی، کہ اس موقع پر انھوں نے کوئی مؤثر کارروائی بھی نہیں کی، بلکہ انگریزی تعلیم کی طرح اس سے بھی کنارہ کش رہے، اور ان کے پاس معقول وجہ بھی تھی، اس لئے کہ وہ ہندوؤں کی ایک مذہبی زبان کو کس طرح اختیار کر سکتے تھے، مگر ہندوؤں کا تعصب اور ان کی تنگ نظری ملاحظہ فرمائیے، کہ بجائے اس کے کہ اپنے برادران وطن کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرتے، اور مشترکہ زبان (پرانی بنگلہ) کو اسکولوں میں رائج کرنے کے ہم خیال ہوتے، انہوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر خوب جی کھول کر اپنے تعصب اور مذہبی دیوانگی کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیا، اور ان اسکولوں کے لئے جو کتابیں تصنیف کیجانے لگیں، ان میں زبردستی سنسکرت کے نامانوس الفاظ ٹھونسے لگے، اور فارسی و عربی کے الفاظ کو نکال باہر کرنا شروع کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنگلہ تعلیم سے مسلمانوں کا تنفر اور بڑھتا گیا، ادھر ہندوؤں کا اور محکموں کی نسبت محکمہ تعلیم پر پورا قبضہ ہوگیا، اور اس عرصہ

میں انھوں نے میدان خالی پا کر سنسکرت کی ترویج میں خوب ہاتھ پاؤں مارے، چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں سنسکرت کی ایک اور لڑکی نے جنم لیکر شہرت حاصل کی جس کو مشکل اور دشوار ہونے میں سنسکرت کی بڑی صاحبزادی کہنا بالکل موزون ہے، مگر تعصب کی حد ہو گئی، کہ اب ہمارے ہندو بھائی اس کو اصلی بنگلہ کہکر اپنی ہندو ذہنیت کا پورا پورا ثبوت دیتے ہیں،

بنگلہ کے ذریعہ ہندو تہذیب کا پرچار

صرف یہی نہیں کہ ہندوؤں نے فقط سنسکرت کا رواج دیا، بلکہ اس عرصہ میں اس زبان کے ذریعہ ہندو تہذیب، ہندو کلچر، اور ہندو مذہب کے پھیلانے مین کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، ہندو دیوتاؤں اور راجاؤں کی جھوٹی تعریفون کے پل باندھ کر اسکولون کی کتابوں میں لکھی گئیں، ان کی زندگی کے کارنامے رتل سے تال بنا کر لکھے گئے، ہندو مسلمانوں میں ناچاقی اور عداوت پھیلانے کے لئے سلاطین اسلام کو لٹیرے اور ڈکیت ثابت کرنے کی ناجائز اور ناکام کوششیں کی گئین، ہندوؤن کے احسانات مسلمانوں پر اور ان کے بدلہ میں مسلمانوں کی نمک حرامی اور غداریاں دکھلائی گئین، کبھی کبھی مسلمان بادشاہون اور مذہبی راہنماؤں کی سخت توہین کی جاتی تھی، جس سے مسلمانون کا قلب اس بُری طرح مجروح ہوتا تھا، کہ وہ ہر امکانی صورت سے اس کا جواب ترکی بہ ترکی دینے پر مجبور ہوتے تھے جس سے آپس میں جھگڑے اور فساد کی خلیج وسیع ہوتی جاتی تھی، اور تیسری اجنبی قوم کی قوت میں اور اضافہ ہوتا جاتا تھا، مسلمانوں کا یہ حال مدتون رہا، اب کوئی نصف صدی سے مسلمانوں نے بنگلہ تعلیم کی طرف پھر رُخ کیا ہے، جس کی اصلی وجہ یہ تھی، کہ انگریزی تعلیم کے ابتدائی درجوں میں بنگلہ کی اعلیٰ تعلیم لازمی ہے، اب اگر پاٹ شالوں سے سرٹیفکٹ حاصل نہ کئے جائین، تو انگریزی اسکولوں میں داخل ہونا دشوار رہا ہے،

علاوہ ازین حکومت کی ہندو نواز پالیسی سے یہ زبان سرکاری اور دفتری تسلیم کر لی گئی تھی لہذا طوعاً و کرہاً بنگلہ کی طرف رُخ کرنا ہی پڑا، مگر اب کیا ہوتا جب چڑیا چگ گئی کھیت تاہم مسلمانون

نے مختلف اوقات میں مذکورہ بالا گندگیون کے خلاف طرح طرح کے احتجاجات کئے، مگر پھر بھی ابھی تک اسکولوں میں ایسی کتابیں داخل درس رہتی ہیں جن میں مذکورہ بالا گندگیان بعینہٖ پہلے کی طرح باقی ہیں، یہی وجہ ہے کہ باوجودیکہ بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، تاہم اسکول میں مسلمان بچون کی تعداد ۲۰ یا ۲۵ فیصدی سے متجاوز نہ ہو سکی،

بنگلہ تعلیم کی ایک اور خرابی

موجودہ بنگلہ کی جہان اور خرابیاں ہیں، وہاں ایک یہ بھی ہے کہ اس کی تحصیل میں کم از کم آٹھ سال صرف ہوتے ہیں، اور پھر اس کے بعد کچھ حاصل بھی نہیں اگر طالب علم خوش نصیب ہوا تو پاٹ شالوں میں دس بارہ روپیہ کی ملازمت مل گئی، یا پٹواری گیری یا اسی قسم کی اور کوئی ملازمت اور بس، ورنہ بیکاری ہی زیادہ ہوتی ہے،

اصلاح کیونکر ہو سکتی ہے

آج چند سال سے مسلمانان بنگال کا ایک طبقہ پھر بیدار ہوا ہے، اور "پرانی بنگلہ" کی طرف مسلمانون کی توجہ مبذول کرا رہا ہے، مگر افسوس! معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک مسلمانون میں احساس خودداری پیدا نہیں ہوا، چنانچہ اس کی دعوت پر لبیک کہنے والے بہت کم لوگ نظر آتے ہیں، ضرورت ہے کہ سب متحد و متفق ہو کر اس تحریک کو کامیاب بنائیں، اور حکومت کو نئی بنگلہ کے بدلنے پر مجبور کرین، نیز ہندو مسلم اتحاد کے دم بھرنے والے ہندو بھائیون کو بھی چاہئے، کہ وہ تعصب و تنگ نظری کے پردوں کو آنکھوں سے ہٹا کر دیکھیں، کہ ہندو مسلم اتحاد "پرانی بنگلہ" کے علاوہ ہو ہی نہیں سکتا، نئی بنگلہ تو خالص ہندوؤن کی مذہبی زبان ہے،

میرے نزدیک اصلاح کی سب سے بہتر اور کارآمد تدبیر یہ ہے کہ خُذہ بالموت حتی یرضی بالحمیٰ کے اصول پر عمل کیا جائے، اور میں نے چند اصحاب سے اس کا استصواب بھی کیا ہے وہ اس طرح ہے، کہ مسلمانان بنگال خوب تندہی کیساتھ اردو کی ترویج و اشاعت میں لگ جائین

اردو میں اخبارات و رسائل شائع کرنا شروع کردیں، لائبریریاں قائم کرکے اردو اخبارات اور رسائل منگوا کر پبلک کو مطالعہ کے لئے دیئے جائیں، ترقی اردو کی انجمنیں قائم کریں وغیرہ وغیرہ، میرے احباب اگر میری مساعدت کریں، تو خدا پر بھروسہ کرکے میرا ایک اخبار شائع کرنے کا ارادہ ہے، جس پر میں بہت دنوں سے غور کر رہا ہوں، اس تدبیر کو کامیاب بنانے کے لئے ہمارے علمائے کرام کی توجہ کی سخت ضرورت ہے، یہ خود اخبارات کا مطالعہ ہمیشہ کریں، دوسروں کو اس کی طرف توجہ دلائیں، نیز مدارس عربیہ میں اردو کی تعلیم کی طرف خاص توجہ کیجائے،

انگریزی تعلیم مسلمانان ہند اس بات کو خوب سمجھے ہوئے تھے، کہ انگریزی تعلیم ہندوستان کی غلامی کی رسی کو اور مضبوط کرنے اور عیسائیت کی تبلیغ کے لئے پھیلائی جارہی ہے، چنانچہ ان کے اس دعوے منصوبہ کو یہ چیز واضح کر دیتی ہو کہ جب انگلستان میں ہندوستان میں انگریزی تعلیم کے مسئلہ پر ۱۸۲۹ء یا ۱۸۳۰ء میں بعہد گورنری لارڈ ولیم بنٹنگ غور کیا گیا تو دو رائیں پیش ہوئیں، ایک یہ کہ عربی اور سنسکرت کو ذریعہ تعلیم قرار دیا جائے، دوسری یہ کہ انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے، آخری رای کی منظوری صرف اس لئے ہوئی، کہ عیسائی پادریوں نے یہ مشورہ دیا تھا، کہ انگریزی زبان تبلیغ عیسائیت کیلئے مؤید و معاون ثابت ہو گی، چنانچہ اسی چیز کے پیش نظر علمائے اسلام نے اس کے عدم جواز کا فتویٰ بھی دیا تھا، اور اسی انجام کی طرف نظر کرکے، جس طرح تمام ہندوستان کے مسلمانوں نے انگریزی تعلیم سے بے توجہی کی تھی، اسی طرح مسلمانان بنگال نے بھی، مگر یہ ذرا سب سے چند قدم آگے تھے، اسلئے کہ کچھ تو علما کے فتوے کا اثر ان پر زیادہ تھا، اور کچھ اس لئے کہ انگریزی ابتدائی تعلیم کے ساتھ بنگلہ کی اعلیٰ تعلیم لازمی ہے، ساتھ ساتھ حکومت نے بھی ہندو نوازی کا ثبوت دیتے ہوئے، بنگال کے مشرقی اضلاع میں جہاں مسلم آبادی ۸۰ اور ۹۰ کے درمیان ہے، تعلیم کو عام کرنے میں بہت کم توجہ کی،

انگریزی تعلیم سے بے توجہی کے وجوہ مذکورۂ بالا وجوہ کے ساتھ ایک معقول وجہ یہ بھی تھی، کہ انگریزی تعلیم

حقیقت میں کوئی سچی تعلیم نہیں ہے، اس لئے کہ کسی اجنبی زبان یا لغت کے سیکھنے کی غرض یہ ہوتی ہے، کہ اس زبان میں کچھ علوم ہیں، جو اس کے ذریعہ حاصل کئے جائیں، کچھ صنعت و حرفت ہیں جو اس زبان کے توسط سے سیکھی جائیں، تاکہ انسان اپنی سیاسی اقتصادی اور اخلاقی ضروریات میں خود اپنا پروگرام مرتب کرسکے، محض زبان کا سیکھنا مقصود بالذات نہیں ہوتا، بلکہ زبان دوسری چیزوں کے حصول کے لئے آلہ اور ذریعہ بنتی ہے، مگر انگریزی تعلیم تو صرف زبان ہی کو سکھاتی ہے، اور زیادہ سے زیادہ نوکری وملازمت کے چند طریقے، جس کا دوسرا نام "غلامی" ہے، اب وہ مسلمان جنھوں نے آٹھ سو سال تک ہندوستان پر حکومت کی ہے، اور ابھی ان کے دماغوں میں اسکی حرارت اور تمازت باقی ہے وہ کہاں اس چیز کو برداشت کرسکتے تھے، کہ اجنبی تاجروں کے چند ٹکڑوں پر صرف ان کے کرایہ کے ٹٹو بنے رہیں، مگر ان سب سے معقول اور زبردست وجہ یہ تھی، جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، کہ انگریزی تعلیم کے ساتھ یورپ کی تہذیب اور مغربی کلچر کا ہندوستان پر حاوی ہو جانا لازمی تھا، اور ساتھ ساتھ یورپ کی فضا سے دہریت اور لامذہبیت کا جو سیلاب چلا آرہا تھا، اس میں ہندوستانیوں کا بہہ جانا ایک لابدی امر تھا، درانحالیکہ عمر اور دیگر ایسے چند قیود کی وجہ سے انگریزی تعلیم میں جانے سے پہلے چھوٹی عمر میں مذہبی امور سے واقف ہو جانا اور پھر انگریزی پڑھنا غیر ممکن ہو گیا تھا، چنانچہ آخر میں ایسا ہی ہوا، بچے ابتدا ہی سے عقائد اسلام اور احکام شریعت سے واقف ہوئے بغیر انگریزی تعلیم میں لگ گئے، اور شروع ہی سے ان کے دماغوں کے اندر دہریت و نیچریت کے جراثیم مرکوز کر دیئے گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ آج ان ہی نام نہاد مسلمان نوجوانوں نے مذہب اور خصوصاً اسلام کے خلاف ایک عالمگیر جنگ چھیڑ رکھی ہے، اکبر الہ آبادی نے کیا خوب کہا ہے، ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا　　　　افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی!

دوسرے موقعہ پر ارشاد ہوتا ہے، ؎

ہم سمجھتے تھے، کہ لائیگی فراغت تعلیم کیا خبر تھی کہ الحاد بھی آجائے گا،(؟)

غرض ان سب وجوہ کی بنا پر مسلمانون نے مدتوں انگریزی تعلیم سے کنارہ کشی کی، شاذونادر جو کوئی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخل ہو جاتا تھا، تو وہ قوم وملت کے نزدیک ذلیل وحقیر سمجھا جاتا تھا،

اب اس بے توجہی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرکاری ملازمتیں اور عہدے سب ہندوؤں کو ملنے لگے تمام سرکاری محکموں پر ہندوؤں کا قبضہ ہوگیا اور مسلمان ہاتھ ملتے ہوئے رہ گئے، ادھر مسلمان محتاج ومفلس بھی ہونے لگے، چنانچہ اسی طرح ایک مدت تک حیران وسرگرداں رہنے کے بعد پھر بنگلہ کی طرح انگریزی کو بھی تقریبًا نصف صدی سے قبول کرنا شروع کیا، اور ساتھ ہی ساتھ انگریزی تعلیم کی موجودہ اسکیم کے خلاف احتجاجات بھی کئے چنانچہ حکومت نے "نیو اسکیم" کے نام سے انگریزی تعلیم کا ایک جدید نصاب مرتب کیا، جس میں عربی کی مختصر چند کتابیں بھی رکھی گئیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ "اُس اسکیم کے مذکورہ بالا عیوب کل کے کل اس اسکیم میں بھی موجود ہین،

فی الحال کالجون اور یونیورسٹیون میں مسلمان لڑکے فی صدی ۴۰ اور ۴۵ کے درمیان ہیں، جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانان بنگال ابھی تک تعلیم میں بہت پیچھے ہیں، علاوہ ازین ایک اور بات قابلِ ذکر یہ ہے کہ مسلمانوں نے تعلیم کی طرف اس وقت رُخ کیا، جب کہ برادرانِ وطن نے تمام محکموں کی ملازمتوں کو پُر کردیا تھا، اب جو مسلمان تعلیم یافتہ ہوئے، تو چونکہ طریقۂ ملازمت کے سوا کچھ اور سکھایا نہیں جاتا، اس لئے بیکار بھی مسلمان زیادہ ہوئے یعنی مسلمان اکثریت کیساتھ ان پڑھ بھی ہیں، اور اکثریت کیساتھ تعلیم یافتہ بیکار بھی،

عربی تعلیم صوبہ بنگال میں عربی تعلیم کے دو نصاب رائج ہیں، ایک مشہور درس نظامی، اور دوسرا مدرسہ عالیہ کلکتہ کے سلسلہ کا نصاب، ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری کے زمانہ میں کمپنی کے دفاتر میں فارسی کی ضرورت پڑتی تھی، اس لئے کچھ تو مسلمانوں کو اس کے ذریعہ پھنسانے کے لئے اور کچھ اپنی ضرورت رفع کرنے کے لئے عربی وفارسی کی تعلیم کے لئے کلکتہ میں مدرسۂ عالیہ کی بنیاد ڈالی گئی تھی جس کی شاخیں سلہٹ وغیرہ دیگر مقامات میں بھی قائم ہوگئیں،

اسکا نصاب سولہ سترہ سال کا ہے جس میں عربی فارسی کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، اور جو فارسی پڑھنا نہیں چاہتا، اسکو انگریزی لینے کا اختیار رہتا ہے، اسکی ابتدائی تعلیم کا نصاب تھوڑے تغیر کے ساتھ درسِ نظامیہ کے نصاب کی طرح ہے، جس کا ذکر آگے آئے گا، درجات اوسط میں فقہ، اصولِ فقہ، بلاغت، فلسفہ منطق، نحو، صرف، حدیث تفسیر اور عقائد وغیرہ کی کتابوں کے خاص خاص حصے شامل ہیں، دو ایک کتابون کے علاوہ کوئی بھی پوری کتاب نصاب میں داخل نہیں ہے، اور جتنے حصے داخل ہیں وہ بھی کامل پڑھائے نہیں جاتے ہین خصوصًا علم فقہ کے ساتھ سخت ظلم کیا گیا ہے، اس کے مخصوص ابواب صوم وصلوٰۃ وغیرہ کے علاوہ کتاب الجہاد وغیرہ نہیں پڑھائی جاتی، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ان ابواب کے پڑھنے سے لڑکوں میں سچے اسلامی جذبات کے متحرک ہونے کا اندیشہ ہے،

اعلی تعلیم کے لئے ٹائٹل کورس کھولا گیا ہے جس میں دو سال کا نصاب ہے، ہر سال اس میں کافی تعداد میں طلبہ پڑھتے ہیں، ٹائٹل کورس پہلے صرف کلکتہ ہی میں تھا، اب چند سال سے دیورائل (سلہٹ کا ایک علاقہ) میں بھی جاری ہوا ہے، اور اب کے آئین جدید کے نصاب کے بعد آسام کا جو پہلا کابینۂ وزارت بنا تھا، اس میں شمس العلما مولینا ابو نصر وحید صاحب وزیر تعلیم مقرر ہوئے تھے، انکی کوششوں سے سلہٹ شہر میں بھی ٹائٹل کورس جاری ہوگیا ہے،

ٹائٹل میں خاص طور سے تاریخ اور حدیث پڑھائی جاتی ہے، مگر حدیث کے لئے صحاح ستہ کے معدودے چند ابواب منتخب کرلئے گئے ہیں، اور کتاب الجہاد وغیرہ کو یہاں بھی نظر انداز کردیا گیا ہے

جس طرح علما نے انگریزی اور بنگلہ تعلیم کو ناجائز قرار دیا، اسی طرح حکومت کے مدارس میں بھی تعلیم

حاصل کرنے کو ناجائز سمجھا، اس لئے کہ ان مدارس سے اکثر شمس العلما، اور فخر المحدثین وغیرہ خطابات لیکر نکلتے ہیں، اور برٹش ایمپائر کے حامی بن کر اس کو ظل اللہ اور خدا جانے کیا کیا ثابت کرکے اپنی نمک حلالی کا ثبوت دیتے ہیں، ہاں ان میں بعض قابلِ تعریف شخصیتیں بھی نظر آتی ہیں، جو شاذ و نادر ہیں،

اور پھر اب تو دفتری زبان بنگلہ اور انگریزی میں تبدیل ہو گئی ہے، جس کے بعد ان مدارس کے فضلاء کو محرری بھی نہیں ملتی......

درس نظامی

مسلمانان بنگال انگریزی اور بنگلہ تعلیم سے کنارہ کش ہو کر خاموش نہیں بیٹھے رہے، بلکہ اپنے علمائے کرام کی سرکردگی میں جگہ جگہ قومی عربی مدارس قائم کرنا شروع کر دیئے، کچھ مدارس تو شاہی زمانہ سے تھے ہی، اب ان میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا رہا، چنانچہ مشرقی بنگال کے اضلاع سلہٹ، کچھار، میمن سنگھ، ڈھاکہ، کملا، اسلام آباد (چاٹگام) نواکھالی وغیرہ کے قصبہ قصبہ اور قریہ قریہ میں مدرسے قائم ہو گئے، اس کا اندازہ اس چیز سے ہو سکتا ہے کہ سلہٹ کا ایک چھوٹا سا علاقہ جہتہ کے نام سے مشہور ہے، جو ایک چھوٹے سے قصبہ اور چند پرگنوں پر مشتمل ہے، فی الحال اس میں ابتدائی و متوسط تعلیم کے ہنٹن مدارس ہیں، جن میں ۵۰ سے ۱۰۰ تک طلبہ تعلیم پاتے ہیں، اور چھ مدارسِ عالیہ ہیں جن میں اعلیٰ تعلیم اور بعض میں دورۂ حدیث کا بھی اچھا انتظام ہے، اور ہر ایک میں ۲۰۰ سے ۲۵۰ تک طلبہ تعلیم پاتے ہیں، اسی طرح ضلع اسلام آباد میں بمقام ہاٹہزاری ضلع رنگپور میں بمقام سید پور اور ڈھاکہ خاص، اور دیگر مقامات میں دورۂ حدیث کا اعلیٰ پیمانہ پر اہتمام ہو گیا ہے، مگر افسوس کہ مغربی بنگال میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں،

یہ مدارس قومی چندوں پر چلتے ہیں، بعض مقامات میں مٹھی کا بھی ایک خاص انتظام ہے، یعنی ہر گھر میں کھانا پکاتے وقت اپنی معینہ مقدار میں سے ایک مٹھی چاول ہر وقت علحدہ کرکے مدرسہ کے لئے رکھ دیا جاتا ہے، اور کسی مقررہ تاریخ پر مدرسہ کے محصلین آکر اسے لیجاتے ہیں،

مدارس میں جو طلبہ تعلیم پاتے ہیں، ان کے قیام و طعام کی ذمہ داری مدرسہ کے قرب و جوار کے مسلمانوں پر ہوتی ہے، ہر وہ گھرانہ جو محنت و مزدوری کرکے خود کھا سکتا ہو، اپنے مکان میں ایک جگہ طالب علم کے لئے خالی کر دیتا ہے، اور وہی اسکے طعام کا بھی کفیل ہوتا ہے،

ان میں جو مدرسین درس دیتے ہیں، ان کو نہایت چھوٹی چھوٹی تنخواہیں ملتی ہیں، مثلاً بہت سے صرف پانچ چھ روپئے پر قناعت کرکے تعلیمی خدمات انجام دیتے رہتے ہیں، اور جہاں کچھ بہتر انتظام ہے، وہاں زیادہ سے زیادہ تیس پچیس روپے کے وظیفے ملا کرتے ہیں، حالانکہ ان میں اکثر اعلیٰ قابلیتوں کے مالک ہوتے ہیں، اور اگر کبھی قحط سالی وغیرہ کی وجہ سے چندے وصول نہیں ہوئے تو مہینوں بلا تنخواہ پڑھاتے رہتے ہیں،

مدارس کے ذریعہ دیہات کی اصلاح

صرف یہی نہیں کہ مشرقی بنگال میں مدارس ہی کثرت سے قائم ہوئے بلکہ ان مدارس کے ذریعہ ان اضلاع کے مسلمانوں کی مذہبی اصلاح اس قدر ہوئی کہ دیہاتوں کے مسلمان تک احکامِ شریعت سے واقف ہو کر صوم و صلوٰۃ کے پابند ہوئے اس کا صحیح اندازہ حضرت شیخ الہند مولٰنا مدنی مدظلہ کے ایک بیان سے ہو سکتا ہے، آپ دیوبند کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "سلہٹ کے ایک علاقہ کا نام جہتہ ہے، وہاں کے مسلمان اس قدر متقی و پرہیزگار ہیں، کہ ان میں سے فی ہزار ایک بھی بے نمازی نکالنا مشکل ہے، یہ ایک خدا کی دین ہے، جو ہر خطہ کو نصیب نہیں ہوتی، یہ چیز موجودہ دور میں نہ مکہ میں پائی جاتی ہے نہ مدینہ میں،" الخ مگر افسوس کہ مغربی بنگال کے دیہاتی مسلمانوں کی حالت اس کے بالکل برعکس ہے جو آیندہ بیان ہو گی،

مگر ایک چیز آج چند سال سے وبا کی طرح پھیل رہی ہے، کہ حکومت ان قومی مدارس کی مالی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر آہستہ آہستہ ان پر اپنا قبضہ جما رہی ہے، بعض مدارس کو بالکل

سرکاری بناکر اس کے نصاب کو بدل کر "ضغث علیٰ اِبالہ" کے مصداق بنا دیا ہے، اور بعض کیلئے قدر سے
امداد منظور کر کے زمامِ اختیار اپنے ہاتھ میں لے رہی ہے، مسلمانوں کو بیدار ہو کر قومی مدارس کی مالی
حالتوں کو درست کرنا چاہئے، اور حکومت کے دسترس سے ان کو محفوظ رکھنا چاہئے،

دیہات میں مکاتب مشرقی بنگال کے اضلاع میں جسطرح عربی تعلیم کے مدارس کثرت سے قائم ہوئے،
ویسے ہی بچوں کی تربیت کے لئے مکاتب بھی کثرت سے قائم ہوئے، چنانچہ دیہات کی تقریباً ہر مسجد میں
ایک ایک مکتب قائم ہے جس میں اس گانوں کے بچے قرآن اور ضروری ایک دو کتابیں بھی پڑھتے ہیں نماز
روزہ کے مسائل اور انکے طریقے سیکھتے ہیں، اکثر یہ خدمت ائمۂ مساجد انجام دیتے ہیں، مگر حفظ قرآن کی طرف
مسلمانانِ بنگال نے بہت ہی کم توجہ کی ہے، اگرچہ بعض مقامات میں اب حفظ قرآن کے مدارس قائم ہوئے
ہیں، تاہم جیسے اسکی ضرورت ہے ویسے ہرگز نہیں، علمائے کرام کو اسکی طرف بہت جلد توجہ کرنی چاہئے،

درس نظامی کا نصاب پہلے پہل بنگال میں صرف ابتدائی ومتوسط تعلیم کا بندوبست تھا جس کے لئے درس
نظامی کا دس سالہ نصاب تھا جن میں فارسی اور عربی کی کتابیں، صرف، نحو، فقہ، اصولِ فقہ، منطق، عربی
ادب فارسی وغیرہ وغیرہ فنون پڑھائے جاتے تھے، چونکہ اس نصاب کی ابتدا شاہی زمانہ
کی ہوئی اور اس زمانہ میں دفتری زبان فارسی تھی، اس لئے نصاب میں فارسی ادب پر بہت زور
دیا گیا ہے، اور بہت سی غیر مفید کتابیں بھی اس میں داخل ہیں، پھر جب انگریزوں کی عملداری
میں دفتری زبان بنگلہ اور انگریزی میں تبدیل ہوگئی، تو یہ نصاب اور بھی بیکار ہوگیا، اسلئے کہ فارسی
میں اسلامی کتابیں بھی زیادہ نہیں ہیں، اور جو دو ایک کتابیں ہیں، ان کے لئے دوسری ضروریات
کو چھوڑ کر فارسی کی اعلیٰ تعلیم میں پانچ چھ سال ضائع کرنے کی ضرورت کیا ہے، زبان سے قدر واقفیت
حاصل ہو جانی کافی ہے، مگر اس کے باوجود بھی یہ نصاب نویں صدی کی ابتدا تک تقریباً
تمام مدارس میں رائج رہا، ہاں اس کے بعد بعض مدارس کے اربابِ حل وعقد کی آنکھیں کھلیں، اور

انھوں نے بعض جدتیں کیں، چنانچہ بعض مدارس سے فارسی کی غیر ضروری کتابیں نکال دی گئیں، اور
ان کی جگہ دوسری مفید کتابیں داخل کر دی گئیں، نیز عربی کی غیر مفید کتابیں بھی بعض مدارس سے
خارج کر دی گئیں اور بعض مدارس میں بنگلا و انگریزی بھی داخلِ نصاب کر دی گئیں، بعض مدارس نے
دار العلوم دیوبند کے نصاب کی تقلید کی، مگر پھر بھی بعض مدارس میں درس نظامی کے نصاب
کو متبرک سمجھ کر باقی رکھا گیا ہے، علاوہ ازیں باوجود اصلاح کے تمام مدارس میں حسب ذیل
چند اصولی خرابیاں موجود ہیں، جن کی اصلاح کی بے حد ضرورت ہے،

عربی تعلیم میں پہلی اصولی خرابی ایک بنیادی خرابی تو عربی تعلیم میں یہ ہے، کہ نصابِ تعلیم سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذہب
اسلام کو صرف نماز روزہ وغیرہ چند عبادتوں میں محدود سمجھا گیا ہے، نعوذ باللہ
میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ عبادت کوئی چیز نہیں ہے، عبادت تو مقصود بالذات ہے، مگر جن چیزوں
کو مقصود بالعرض کے طور پر اسلام نے اپنے اندر داخل کیا ہے، اور جن کو قرآن نے مذہب کے
اندر شمار کیا ہے، اور جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تئیس سالہ تبلیغی زندگی میں ان عبادتوں
کے ہم پلہ بلکہ بعض وقت ان پر مقدم رکھا ہے، کیا ان چیزوں کو نظر انداز کر دینے کے بعد یہ عبادتیں
چند بے معنی اور بے حقیقت چیزیں نہیں رہ جاتیں، یہ ایک حقیقت ہے، جس پر ہمارے علمائے کرام
کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے،

دوسری اصولی خرابی یہ ہے کہ عربی و فارسی زبانوں کے سکھانے کا ایسا بھدا طریقہ اختیار
کیا گیا ہے، جس کی نظیر دنیا کی کسی تعلیم میں ملنی مشکل ہے، تعلیم کا اصل طریقہ یہ ہے کہ جس زبان یا لغت
میں تعلیم دینا ہو، اولاً بچوں کو وہ زبان سکھائی جاتی ہے، اور جب انہیں اتنی مہارت حاصل ہو جائے
کہ وہ اس میں تحریر و تقریر پر قادر ہو جائیں، تب اس کے بعد اس زبان میں جو علوم و فنون
ہیں وہ سکھائے جاتے ہیں، مگر عربی تعلیم کا یہ انوکھا طریقہ سن کر آپ تعجب کریں گے، کہ یہاں عربی و

فارسی زبان کی تعلیم کیساتھ ہی ساتھ ابتدا ہی سے وہ علوم بھی شروع کرا دیئے جاتے ہیں، جو عربی وفارسی میں ہیں، اور وہ بھی ایک دو نہیں، بلکہ چار چار، پانچ پانچ فنون کی پانچ پانچ چھ چھ کتابیں ابتدائی درجوں میں اور آٹھ آٹھ دس دس فنون کی اتنی ہی کتابیں متوسط اور اعلیٰ درجات میں اور یہ طریقہ ابتدا سے انتہا تک باقی رہتا ہے، بلکہ فنون کی تعلیم ختم ہو جاتی ہے، مگر زبان کی تعلیم ختم ہی نہیں ہوتی، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بنگال کے طلبہ دس بارہ سال کی تعلیم اپنے وطن میں پاتے ہیں، اور اکثر طلبہ وہاں سے فارغ ہو کر شمالی ہند کے عربی مدارس میں آکر اپنی پڑھی ہوئی اکثر کتابیں پھر سے پڑھتے ہیں، غرض اٹھارہ بیس سال کی عربی تعلیم کے باوجود ۹۵ فیصدی ایسے نکلتے ہیں، جو نہ عربی زبان میں تحریر و تقریر پر قادر ہوتے ہیں، اور نہ اس زبان کے ذریعہ جو علوم اس طویل عرصہ میں حاصل کرتے ہیں، ان پر عبور ہوتا ہے، بلکہ میں تو یہاں تک دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ۵۰ فیصدی ایسے ہوتے ہیں، جو عربی کتابوں کی صحیح عبارت پڑھ کر مطلب بھی نہیں سمجھ سکتے، اور یہ سب خرابیاں صرف طرز تعلیم کی لائی ہوئی ہیں، جب سیکڑوں سال کے تجربہ سے یہ طریقہ غیر مفید ثابت ہو چکا ہے تو کیا وجہ ہے کہ اس طرز کو تبدیل نہ کر دیا جائے،

تیسری اصولی خرابی، یہ ہے کہ ان مدارس میں اردو کی تعلیم کی طرف کچھ بھی توجہ نہیں کیجاتی، اور پھر درس دیتے وقت عربی وفارسی کتابوں کا ترجمہ اور تقریر اردو ہی میں کیجاتی ہے، اور چونکہ لڑکے اردو سے واقف ہوتے نہیں، اسلئے نہ اردو ہی اچھی طرح سمجھتے ہیں اور نہ عربی فارسی، ضرورت اس کی ہے کہ اردو کی اشاعت کے ذرائع پر غور کیا جائے، اور جتنی صورتیں اس کے حلقۂ اشاعت کو وسیع کرنے کی ممکن ہوں، وہ سب اختیار کیجائیں، نیز ابتدائی درجوں میں اردو کی باقاعدہ تعلیم دیجائے اور اسکو عربی وفارسی کے لئے ذریعۂ تعلیم قرار دیا جائے، اگر ایسا نہیں کیا جا سکتا تو پھر عربی وفارسی کی کتابوں کا ترجمہ و تقریر پرانی بنگلہ ہی میں کیجائے،

شمالی ہند میں بنگالی طلبہ پہلے چونکہ صوبہ بنگال میں اعلیٰ تعلیم کا بندوبست نہیں تھا، اسلئے ابتدائی و متوسط تعلیم حاصل کرنے کے لئے بعض طلبہ شمالی ہند کے مختلف عربی مدارس میں جاکر آٹھ دس سال تعلیم حاصل کرتے تھے، لیکن اس طول طویل سفر میں بہت سی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا، بہت زیادہ معارف برداشت کرنے پڑتے تھے، اسلئے علمائے نے اسکی طرف توجہ کی، اور آہستہ آہستہ ہر جگہ اعلیٰ تعلیم کا بندوبست ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سے مقامات میں دورۂ حدیث کا بھی انتظام ہو گیا، تاہم چونکہ شمالی ہند میں کچھ دن بسر کرنا ایک رسم ہو گئی تھی، اور بغیر اس کے مولویت کی تکمیل نہیں ہوتی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال میں عربی مدارس جتنے زیادہ ہوتے گئے، شمالی ہند میں جانے والے طلبہ کی تعداد اتنی ہی روز بروز بڑھتی گئی اور اب یہاں تک نوبت پہونچ گئی ہے، کہ پچھلے سال ایک تخمینی اعداد و شمار سے معلوم ہوا ہے، کہ بنگال کے کم و بیش پانچ ہزار طلبہ شمالی ہند کے مختلف اضلاع میں تعلیم پاتے ہیں، جن کی عمریں ۲۵ اور ۴۰ کے درمیان ہیں، سب سے بڑی تعداد ریاست رام پور میں ہے، جو سات سو سے کسی طرح بھی کم نہیں، تجربہ سے یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ شمالی ہند میں آکر تعلیم حاصل کرنے میں چند خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں،

ایک تو یہ ہے کہ چونکہ بنگال کے نصاب اور یہاں کے نصاب ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اس لئے جو کتابیں اپنے وطن میں وہ پڑھ کر جاتے ہیں، اکثر ان ہی کو دوبارہ پڑھنا پڑتا ہے جس سے دگنی عمر ضائع ہوتی ہے،

دوسری یہ ہے کہ ایسا کرنے سے تعلیم کا ایک مقصدِ عظیم یعنی تبلیغ و اشاعتِ اسلام فوت ہو جاتا ہے، اس لئے کہ بنگال میں تبلیغ کرنے کے لئے نئی بنگلہ یا پرانی بنگلہ میں قدرت ہونی چاہئے، کہ مقامی مادری زبان اپنے ہی ضلع یا علاقہ تک محدود ہوتی ہے، علاوہ ازیں تعلیم یافتہ طبقہ میں یہ پسندیدہ بھی نہیں ہے، اور یہ تعلیم یافتہ نہ نئی بنگلہ پڑھکر آتے ہیں نہ پرانی بنگلہ جانتے ہیں، اور نہ اردو ہی

میں انکو پوری مہارت ہوتی ہے،

ایک خرابی یہ بھی ہے کہ آب و ہوا کے مختلف ہونے اور چاول و گیہوں کی تفاوت کی و[جہ]
سے طلبہ کی صحت پر بھی برا اثر پڑتا ہے،

ان سب میں بڑی خرابی یہ ہے کہ یہاں آکر اپنی جوانی کے آٹھ دس سال کچھ اس قدر ناگفتہ بہ
حالت میں گذارتے ہیں، کہ ان میں احساسِ غیرت، حمیت خودداری، اور روح کی حرارت و گرمی
باقی نہیں رہتی، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ باطل کے مقابلہ میں کبھی اعلانِ حق نہیں کر سکتے، بلکہ اس
کے سامنے ہمیشہ ان کا سر جھکا رہتا ہے،......

بنگال کی تعلیم کے ساتھ ساتھ علماے کرام کے سیاسی و مذہبی حالات بھی قدرے لکھدینا مناسب
معلوم ہوتا ہے،

علماے بنگال کی مذہبی حالت بنگال میں عربی مدارس کی کثرت کی وجہ سے بفضلہ تعالیٰ مشرقی بنگال
میں علم دین کا ایسا چرچا ہے کہ بہت کم گاؤں ایسے نظر آئیں گے، جن میں شمالی ہند کا کوئی سند
یافتہ عالم دین نہ ہو، اور ویسے تو بعض بعض دیہات میں آٹھ آٹھ دس دس حضرات ایسے ہیں، مگر
ان کی مذہبی حالت بحیثیت مجموعی کچھ زیادہ قابلِ تعریف نہیں ہے، ہم نے سطور بالا میں بیان کیا ہے
کہ علماے کرام میں پانچ فی صدی ایسے حضرات ہوتے ہیں، جو اعلیٰ قابلیت کے مالک اور عربی و
فارسی اور اردو میں تحریر و تقریر پر قادر ہوتے ہیں، اعلیٰ دماغ رکھتے ہیں، عالی ہمت ہوتے ہیں،
غرض ایک عالم دین میں جتنے صفاتِ حمیدہ ہونے چاہئیں، وہ سب ان میں موجود ہوتے ہیں،
اور باقی ۹۵ فیصدی سے مخلوقِ خدا کو نفع بہت کم پہنچتا ہے، مگر ان پانچ فی صدی کی حالت
یہ ہے کہ چونکہ ان کے سامنے تعلیم کے ساتھ ساتھ کوئی مستقل تعمیری پروگرام، اور ان کا کوئی
لائحۂ عمل یا خاص نصب العین نہیں ہوتا، اس لئے وہ اپنی قوت کو زیادہ تر آپس کے جھگڑ[وں]

میں صرف کرتے ہیں، فروعی مسائل میں بحث و مباحثہ کرنے میں ان کے اوقات ضائع ہوتے
ہیں، اور ان مناظروں میں کبھی کبھی قتل و قتال تک نوبت پہونچ جاتی ہے، چنانچہ مشہور ہے کہ ضلع
سلہٹ کے علاقہ میں "ض" کے تلفظ کے مسئلہ پر لڑائی میں ایک یا دو آدمی ایک موقع پر شہید بھی ہوگئے،

بعض حضرات مدارس عربیہ میں درس و تدریس دینے میں مشغول ہو جاتے ہیں، مگر چونکہ بنگال
میں ایسا کوئی کتب خانہ نہیں ہے جس میں علم کے پیاسے بڑے بڑے علوم و فنون کی کتابوں کے مطالعہ
سے اپنی پیاس بجھائیں، اور اپنے معلومات میں اضافہ کریں، اسی لئے علماے بنگال باوجود علمی استعداد
رکھنے کے تصنیف و تالیف میں ابھی تک کوئی قابلِ قدر ترقی نہیں کر سکے، علماے بنگال شمالی ہند سے
جاتے وقت متفرق طور پر جتنی کتابیں اپنے ساتھ لیجاتے ہیں، اگر ان میں سے ہر ایک صاحب ایک
ایک کتاب جمع کرنا شروع کر دیں تو ہر ضلع میں بڑے بڑے کتب خانے قائم ہو سکتے ہیں،

ادھر مشرقی بنگال میں علماے کرام کا یہ مشغلہ ہے، اُدھر مغربی بنگال کے مسلمانوں کی حالت
کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، وہاں اوّلاً مسلمان اقلیت میں ہیں، اور پھر تقریباً ان کی
کل آبادی دیہات میں ہے، جو جہالت و گمراہی کی گران بار زنجیروں میں گرفتار ہے، یہ محض نام کے
مسلمان ہیں، ان کے سب رسم و رواج ہندوانہ ہیں، چوٹی وہ رکھتے ہیں، دھوتی وہ پہنتے ہیں،
ہندوؤں کی پوجا پاٹ میں انکی محفلوں کی رونق وہ بڑھاتے ہیں، نماز روزہ کے نام سے بہت کم واقف
ملتے ہیں، ان کے پاس یا ہندو سنیاسی اور برہمن جاتے ہیں، یا شرابی کبابی مسلمان پیر و فقیر علما
کی صورت سے بھی بعض جگہ لوگ گھبراتے ہیں، کم و بیش یہی حال آسام کے مشرقی اضلاع (آسام
ویلی) کے مسلمانوں کا ہے، سلہٹ کے نیم تعلیمیافتہ مولوی اور بعض فضلا بھی "آسام ویلی" میں چلے
جاتے ہیں اور وعظ و نصائح کر کے کچھ کما لاتے ہیں، یہ لوگ ان کی مسجدوں میں امامت بھی کرتے ہیں
مگر ان کی اصلاح کی طرف توجہ نہیں کی گئی، اور نہ اسلام کی اصلی صورت ان کے سامنے پیش کی گئی

کوشش کی گئی،

قادیانی فتنہ مشرقی بنگال میں علمار کی بڑی کثرت ہے، اس کے باوجود برہمن باڑیہ (ضلع کملا) کے ایک علاقہ میں قادیانیون نے جنم لیا، اس کا واقعہ یہ ہے کہ مرزا غلام احمد کی زندگی میں علاقہ مذکور کے ایک مولوی صاحب ان سے مناظرہ کرنے کے لئے قادیان گئے، مگر ان پر بدبختی اور نحوست ایسی چھائی کہ خود غلام احمد کے ہاتھ اپنی متاع ایمان فروخت کر کے واپس آئے، مرزا صاحب نے ان کو "خلیفۂ بنگال" کا خطاب دیا، پہلے پہل تو لوگوں نے اس کو بہت بُرا سمجھا، مگر آہستہ آہستہ کچھ لوگ ان کے دام فریب میں پھنس گئے، اور اب تو بنگال میں مرزائیوں نے ایسی ادھم مچائی ہے کہ سارے بنگال مین اپنے جال بچھا دیئے ہیں، اور یہ سب کچھ علمائے کرام کی بے توجہی اور لاپرواہی کا نتیجہ ہے، جو نہ خود اس فتنہ کی حقیقت سے واقف ہونے کی کوشش کرتے ہیں، اور نہ اوروں کو آگاہ کرتے ہین، ایسی حالت میں مقابلہ کیا خاک کرین گے، قادیانیوں کے علاوہ عیسائی مشنریاں تو ہر جگہ ہیں، جو غریب مسلمانوں کو جاہل پاکر، انھین طرح طرح کی دنیاوی طمع دیکر ان کی متاع ایمان کو لوٹتی رہتی ہین، دوسری طرف ہندو سنگھٹن مغربی بنگال میں اپنی کارروائیوں میں مشغول ہے جو ہر سال جاہل دیہاتی مسلمانوں کی کافی تعداد کو دھوکہ اور فریب میں پھنساتا ہے، اور علما ہیں کہ خاموش بیٹھے ہیں،

علمائے کرام کی سیاسی حالت علمائے کرام جس طرح مذہبی امور میں عوام کے قائد و رہنما ہوتے ہیں اسی طرح سیاسی امور میں بھی، مگر بنگال کے علمار کی یہ حالت ہے، کہ وہ خود دیدہ و دانستہ سیاست ملکی سے کنارہ کش رہتے ہیں، تحریکِ خلافت میں انھوں نے ایسا حصہ لیا تھا، کہ شاید ہی کسی اور صوبہ کے علما نے لیا ہو، مگر چونکہ عدم تشدد کی حدود سے کچھ باہر نکل آئے تھے، اس لئے حکومت نے بھی اس کو دبانے میں اس قدر ظلم و تشدد کو استعمال کیا کہ تمام مسلمانانِ بنگال

خصوصًا یہان کے علمار پر ایسا خوف وہراس طاری ہوا، کہ تحریکِ خلافت کے ختم ہوتے ہی وہ میدانِ سیاست سے اس طرح بھاگے کہ اب اس کا نام لینے سے بھی گھبراتے ہین، مسلمانانِ بنگال کے ہاتھ مین اولاً اخبارات ہی نہیں ہیں اور جو دو ایک ہیں انکا مطالعہ بھی علمائے کرام نہیں کرتے اور خود ان میں سے کسی صاحب کے ہاتھ میں کوئی اخبار بھی نہیں ہے، جو مسلمانوں کی صحیح ترجمانی کر سکے، .....

اگر مسلمانانِ بنگال میں پھر سے سیاست کی روح پھونکنی ہے، تو یہ کام صرف علمائے کرام ہی کی توجہ سے ہو سکتا ہے، اس لئے کہ عوام پر ان ہی کا کنٹرول ہے، انگریزی خوان طبقہ کا اثر ان پر بہت کم ہے، علمائے کرام کو چاہئے، کہ وہ اپنے فریضہ کا احساس کرین، اور مسلمانوں کی رہنمائی کی طرف بہت جلد توجہ دین، ......

مذہبی وسیاسی جماعتین اور علمار ہم نے علمائے کرام کے مذہبی و سیاسی حالات جو اوپر بیان کئے ہیں، وہ اکثریت کے اعتبار سے ہین، ورنہ ان میں بہت سے ایسے حضرات بھی موجود ہیں، جنھوں نے اسلام اور مسلمانون کی مذہبی وسیاسی خدمات کے لئے اپنی زندگی وقف کردی ہے، بعض حضرات پرجا پارٹی میں بھی شریک ہین، اور بعض مسلم لیگ کے ساتھ بھی اشتراکِ عمل کرتے ہیں، اور علمائے کرام کی خاص جماعت جمعیۃ العلما، دہلی کی شاخ بھی بنگال میں قائم ہے، علاوہ ازین بعض مقامات مین تبلیغی انجمنین بھی قائم ہین مگر چونکہ انکی تعداد بہت کم ہے اسلئے وہ اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر سکتے، بلکہ مزاحم طاقتون سے ٹکرا کر ہمت ہار دیتے ہیں، علمار کی جماعت میں سب سے اعلیٰ خدمات جمعیۃ العلما جبیتہ نے انجام دی ہیں، اور دے رہی ہے خصوصًا علاقہ جبیتہ کے دیہاتی مسلمانوں کو نماز روزہ وغیرہ کے مسائل اور احکام شرعیہ سے واقف کرنے میں جو خدمات اس نے انجام دیئے ہیں وہ تاریخ کے اوراق میں سنہری حرفوں سے لکھی جائینگی،

مضمون کے بعض حصے اگرچہ بعض حضرات کو ناگوار خاطر ہونگے، مگر میں نے محض مسلمانوں کی اصلاح کیلئے خالصًا لوجہ اللہ سچی سچی باتیں لکھی ہیں جس سے کسی کو ناگواری نہ ہونی چاہئے،

تلخیص و تبصرہ

دنیاے فلسفہ

گذشتہ چند مہینوں میں فلسفہ کی جو کتابیں شائع ہوئی ہیں، ان میں پروفیسر سی، ڈی، بروڈ کی میک ٹگارٹ کے فلسفہ کا جائزہ" (EXAMINATION OF MCTAGGART'S PHILOSOPHY) نہایت اہم ہے، مصنف کا دعویٰ ہے کہ اس کتاب کے موضوع پر جو قدرت اس کو ہے، وہ خدا کے سوا کسی اور کو نہیں، اس نے میک ٹگارٹ کے آخری زمانہ کی تحریروں پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے، میک ٹگارٹ کی کتاب "وجود کی فطرت" (NATURE OF EXISTENCE) کی پہلی جلد ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی تھی اسکی دوسری جلد ڈاکٹر بروڈ نے مرتب کرکے ۲۷ء میں یعنی میک ٹگارٹ کی وفات کے دو سال بعد شائع کی، پہلی جلد میں ہر اس چیز کی خصوصیات قرار دینے کی کوشش کی گئی تھی جو وجود رکھتی ہے، اس پر بھی ۳۳ء میں ڈاکٹر بروڈ نے ایک کتاب لکھی تھی، زیرِ نظر کتاب میک ٹگارٹ کی دوسری جلد سے متعلق ہے،

میک ٹگارٹ نے اس کتاب میں مادہ اور خدا کے وجود اور عدم وجود، روح اور ذات کی فطرت، جذبات خصوصاً محبت کی نوعیت، فنا اور بقا، اور زمانہ کی حقیقت اور غیر حقیقت کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے، ان مختلف موضوعوں پر پروفیسر بروڈ نے اپنی کتاب میں جو بحثیں کی ہیں وہ بہت ہی مدلل اور مکمل ہیں، مابعد الطبعیاتی نقطۂ نظر سے زمانہ کی توضیح بہت ہی ضروری شے ہے کیونکہ زمانہ کے غیر حقیقی ہونے کا نظریہ ہیگل سے نکل کر براڈلے تک طریق تصوریت کا بنیادی

اصول رہا ہے، لیکن میک ٹگارٹ نے جن اسباب کی بنا پر زمانہ کی حقیقت کا انکار کیا ہے وہ عام نظریوں سے بالکل مختلف ہیں،

عام طور پر زمانہ میں حال، ماضی اور مستقبل یعنی تقدم اور تاخر کے ذریعہ سے امتیاز پیدا کیا جاتا ہے، تقدم زمانہ کے ساتھ لازمی ہے، کیونکہ تاخر میں تغیر نہیں ہوسکتا، مگر میک ٹگارٹ کے دلائل یہ ہیں کہ زمانہ میں تقدم متضاد چیز ہے، کیونکہ ماضی حال اور مستقبل میں متباین خصوصیات ہیں، اور اس تضاد اور تباین سے گریز کرنے کی کوشش میں ایک لامتناہی رجعت پیدا ہو جاتی ہے، پروفیسر بروڈ نے ان براہین کو اپنے دلائل سے اس طرح رد کیا ہے کہ تضاد سے گریز کا موقع ہی نہیں آتا ہے، اس لئے لامتناہی رجعت کی ضرورت ہی نہیں پیش آتی ہے، یہ سچ ہے کہ ماضی، حال، اور مستقبل اس معنی میں متباین ہیں کہ کوئی چیز ایک ساتھ ان تینوں زمانوں میں یا ان کے علاوہ کسی زمانہ میں واقع نہیں ہوتی، لیکن اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ بعض چیزیں یکے بعد دیگرے ظہور میں آتی ہیں، اس سے وقت کے تعین میں کوئی تضاد پیدا نہیں ہوتا، زمانہ کی حقیقت کے انکار سے تغیر و تبدل کی حقیقت سے بھی انکار کرنا ہے، میک ٹگارٹ سے یہ بھول ہوئی ہے کہ وہ قائم بالاصل کو بھی لائق تغیر و تبدل سمجھتا ہے، اسی لئے ان میں زمانی ربط کے بجاے غیر زمانی ربط اور زمانی صفات پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے،

"زمانہ اور اس کی اہمیت جدید تخیل میں" TIME & ITS IMPORTANCE IN MODERN THOUGHTS کے نام سے ایک دوسری اہم کتاب ڈاکٹر ام۔ اے۔ کلیو کی شائع ہوئی ہے، زمانہ کے مابعد الطبعیاتی مسائل کا تجزیہ کرنے سے پہلے ڈاکٹر موصوفہ نے زمانہ سے متعلق نفسیاتی، طبعیاتی اور منطقیانہ مباحث پر نظر ڈالی ہے، اس کا خیال ہے کہ ہم کو حال کا احساس حال کی حیثیت سے نہیں، بلکہ ماضی اور مستقبل کے مقابلہ میں ہوتا ہے، نفسیاتی طور سے زمانہ کی پرواز اور عدم رجعت پذیری پر یقین

تجربہ سے آتا ہے، جب کہ حال ماضی میں منتقل ہو جاتا ہے، یہ تجربہ اتفاقیہ واقعات کے نتیجہ سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ ماضی اور حال کا تسلسل برابر قائم رہتا ہے، طبیعیاتی پہلو سے واقعات پر غور صرف ان کے ظہور پذیر ہونے اور اُن کی ترتیب پر کیا جاتا ہے، اس لئے یہاں پہلے اور بعد میں کوئی زمانی ربط نہیں ہے، اگرچہ ان کے متعلقہ عناصر زمانی ہوتے ہیں،

منطقیانہ اصول سے بحث کرتے ہوئے، مصنفۂ مذکورہ نے اس پر زور دیا ہے کہ پہلے وقت کے شعوری اور تصوری احساس میں تمیز کرلی جائے، زمانہ جس کا تصور ہم کرتے ہیں، غیر محدود ہے، جو لامتناہی سلسلہ کی طرح برابر جاری ہے، لیکن اس کے تسلسل مین تقدم اور تاخر ہے جو ضروری طور پر ماضی، حال اور مستقبل کے مساوی قرار نہیں پاسکتا ہے،

اس کے بعد زمانہ کے مابعد الطبعیاتی مسائل پر پانچ ابواب ہیں، جن میں کانت، برگسان، الگزنڈر، میک ٹگارٹ اور ڈن کے نظریوں پر مباحث ہیں، ڈاکٹر برگسان زمانہ کو ایک تخلیقی وجود قرار دیتا ہے جس کو ڈاکٹر کلیو صحیح اور درست سمجھتی ہے، برگسان کی اس چیز کی وہ تعریف کرتی ہے کہ وہ زمان اور مکان کی تمثیل کو مغالطہ آمیز سمجھتا ہے، کیونکہ اس سے زمانہ کی عدم رجعت پذیری اور وجود کی خصوصیات نظرانداز ہو جاتی ہیں، الگزنڈر کا نظریہ ہے کہ زمانہ اور ذہن میں مماثلت ہے، اس تخیل کو ڈاکٹر کلیو بہت ہی ذہن رسا قرار دیتی ہے، مگر اس تخیل سے زمان اور مکان کے ربط میں جو اغلاق واقع ہے، وہ دور نہیں ہوتا، اور یہ ایسا اغلاق ہے جو بہت ہی طباع اور ذہین تمثیل بھی دور نہیں کرسکتی ہے، میک ٹگارٹ کا نظریہ کہ ماضی، حال اور مستقبل محض ربط ہیں، جن میں واقعات زمانہ سے ماورا ظہور پذیر ہوتے ہیں، ڈاکٹر کلیو کے نزدیک قابل قبول نہیں کسی ذات یا وجود کے زمانہ سے ماورا ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ایک حقیقت زمانہ کے بغیر قرار پاسکتی ہے، جو بلا شک وشبہہ تسلیم کرنے کے لائق نہیں،

اس کتاب کے دوسرے حصہ مین بعض مابعد الطبعیاتی مسائل مثلاً "پشین گوئی" "عدم رجعت پذیری" "وجود" "اتفاقی واقعہ" اور "حقیقت" پر روشنی ڈالی گئی ہے، اول الذکر مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر موصوفہ نے بتایا ہے کہ ایک واقعہ کا ہونا بالکل غیر متعین اور غیر ممکن الاثبات ہوتا ہے، گو یہ ممکن ہے کہ کسی واقعہ کے متعلق یہ کہا جائے کہ یہ ہوگا اور وہ ہو جائے، لیکن پشین گوئی میں واقعیت قرار دیجائے تو پھر یہ پشین گوئی باقی نہیں رہتی، واقعات کے ہونے اور یقینی ہونے میں تضاد ہے، زمانہ کے ناقابلِ رجعت پذیر ہونے کے سلسلہ میں ڈاکٹر کلیو کا خیال ہے کہ اگر زمانہ کو جوہر مطلق نہیں بلکہ واقعات کے سلسلہ کی ترتیب تصور کرلیا جائے تو صحیح طور پر یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ زمانہ رجعت پذیر ہوسکتا ہے یا نہیں،

پروفیسر جے۔ ال۔ اسٹوکس کی کتاب "زمانہ، سبب اور بقا" (TIME CAUSE & ETERNITY) میں بھی اسی قسم کے موضوع سے بحث ہے، پروفیسر موصوف کی اصلی بحث اس نظریہ پر ہے کہ زمانہ کا انحصار ایک لامتناہی بقا پر ہے، اس تخیل کی توضیح کرتے ہوئے اس نے سبب کے تخیل پر زیادہ توجہ دی ہے، اگر زمانہ کا انحصار بقا پر ہے تو ان دونوں میں کوئی علتی ربط ضرور ہونا چاہئے، لیکن بظاہر ابدیت اور زمانہ میں کوئی زمانی ربط نہیں ہوسکتا ہے، گو یہ ممکن ہے کہ ہمارے سبب کا تخیل ہی بہت محدود ہو اور زمانی قیاسات کی رو سے اس کی تشریح کافی نہ ہو،

اس کتاب کے پہلے باب میں زمانہ اور سبب کے یونانی نظریہ پر بحث ہے، ارسطو نے چار اسباب بتائے ہیں، چنانچہ اس باب میں ان ہی چار اسباب پر زیادہ توجہ دی گئی ہے، ارسطو نے مرورِ ایام سے زیادہ عوارض موجودہ پر زور دیا ہے، دنیا کو ایک عظیم الشان منظم ہیئت تصور کیا ہے، جو محض قائم ہے،

دوسرے باب میں زمانہ اور سبب کے موجودہ تخیل پر بحث کی گئی ہے، جدید عہد کی دو چیزین

پیشِ نظر رکھی گئی ہیں، فطری سائنس اور تاریخی نقطۂ نظر انیسویں صدی کا سائنٹفک عقیدہ جو مِل کی تحریروں میں پایا جاتا ہے، مِل نے اس کو اصول موضوعہ کی طرح تسلیم کیا تھا کہ حال سے مستقبل اور جزء سے کل بنتا ہے، اس کے نظریہ کے مطابق انسانی ذہن، خیال اور قوتِ ارادی محض ایک نظام کا تطابق کرتی ہیں، انیسویں صدی میں تاریخی نقطۂ نظر پر زیادہ زور دیا گیا، بری نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ ترقی کا تخیل ضرورت پر تو مبنی تھا لیکن دنیا کی ہیئت، ترتیب اور نظام میں اس سے انسان کا محض عروج اور بلندی مقصود تھا، یہ سائنس کے نظریہ کے لحاظ سے بالکل نئی چیز تھی، پروفیسر اسٹوکس کا خیال ہے کہ برگسان کا فلسفہ اس مسئلہ سے بہت ہی قریب تر ہے لیکن اسکو ارسطو کے فلسفۂ غایات (یعنی یہ نظریہ کہ کائنات کے تمام تغیرات کسی غایت یا مقصد سے واقع ہوتے ہیں) سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برگسان نہ صرف غایت اور آخری سبب کو موردِ بحث میں لانا چاہتا ہے، بلکہ اس کے علاوہ ارسطو کے بقیہ اور تین اسباب کو بھی متعارف کرنا چاہتا ہے، تیسرے باب میں مصنف "تعمیر" کے عنوان سے سائنس اور تاریخ کے مابعد الطبعیات میں ربط پیدا کرنا چاہتا ہے، اس قسم کے ربط کی شرائط آسانی سے پوری ہو سکتی ہیں، اگر یہ نظریہ نظر انداز کر دیا جائے کہ مرورِ ایام بدیہی ہیں، اور پھر فطرت اور انسانی تاریخ کو ایک ہی چیز تصور کر لیا جائے،

بہرحال مذہبی اور مابعد الطبعیاتی پہلو سے وہی بقا اہم اور ابدی ہے جس کا زمانہ کے ساتھ علتی ربط ہو،

"بزم ارسطو کی روئداد" کی ایک نئی جلد لندن سے شائع ہوئی ہے، اس میں وہ تمام مقالات ہیں جو اس کے اٹھانوے اجلاس ۳۷-۱۹۳۶ء میں پڑھے گئے تھے، اس اجلاس کی صدارت پروفیسر الگزنڈر نے کی تھی، خطبۂ صدارت کا موضوع "آرٹ میں ہیئت اور مضمون" تھا، پروفیسر موصوف

کا خیال ہے کہ ایک آرٹسٹ اپنے ذہن سے بعض اجزاء کا اختراع کرتا ہے، جنکو وہ کسی ظاہری اور جسمانی شے سے ممزوج کر دیتا ہے، اور اس طرح وہ ایک ایسی شے تیار کرتا ہے جس سے وہی عناصر ظاہر ہوتے ہیں جن کا اختراع اس نے اپنے ذہن میں کیا تھا، ایک آرٹ کی ہیئت پہلے تصور کر کے قرار نہیں کر لی جاتی ہے، بلکہ ہیئت اور تصور میں امتزاج اتنا فوری ہوتا ہے کہ آرٹ کی شکل اور ہیئت فوراً تجربہ سے معلوم ہو جاتی ہیں، ایک ماہرِ فن جو سامان استعمال میں لاتا ہے انکو اس لئے ترتیب دیتا ہے کہ ذہن سے جدید عناصر ظاہر ہو جاتے ہیں، اور معنی خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں، فطرت کا حسن صرف ماہرِ فن کی آنکھیں دیکھ سکتی ہیں، حسین فطرت اسی کی دیکھی ہوئی چیزوں کا نام ہے، ایک حسین تصور اسی کے سامان کی پرکاری ہوتی ہے، جو فطرت میں منتقل ہو جاتی ہے، ایک ماہرِ فن تازہ فطرت پیدا کرتا ہے جس میں فطرت کی انفرادیت بہرحال قائم رہتی ہے،

اسی روئداد میں پروفیسر لینگلے کا ایک مقالہ "آزادی اور جدید سیاسی تخیل" کے عنوان سے ہے، پروفیسر موصوف کا خیال ہے کہ آزادی کی بنیاد ایک مختلف الاجزا اتحاد کی محرکات پر ہوتی ہے، ایک حکومت کا فرد خود قوانین بناتا ہے اور خود اس کا ماتحت ہو جاتا ہے، اس سے وہ اپنے نہج کے بعض مقاصد کو پورا نہیں کر سکتا ہے لیکن یہ اس کا کوئی ایثار نہیں، بلکہ وہ ایثار کئے بغیر اپنے کو دوسرے کے ساتھ ایک عام قانون کے ماتحت متحد پاتا ہے، اسی اصول کی بنیاد پر وہ موجودہ عہد کی فسطائیت، اشتراکیت اور جمہوریت کا جائزہ لیتا ہے، اور ان کا ردِ عمل انفرادی آزادی پر کیا ہو رہا ہے وہ بھی بتاتا ہے، اس روداد میں بعض اور پر از معلومات مقالات ہیں، مثلاً اے، کے، اسٹوٹ کا "آزاد خواہش اور ذمہ داری" پروفیسر کیمبل کا "اخلاقی معیار کے نظریہ کا مقدمہ" وغیرہ وغیرہ،

مسز کوِنٹینس مونڈ کی کتاب "ہیوم کے نظریۂ علم کا جائزہ" بھی بہت ہی اہم ہے، اس کتاب

مین ہیوم کی علمیات کا بہت ہی عمیق اور محتاط مطالعہ ہے جو ہیوم کے ہر طالبعلم کے لئے ضروری ہے، عام طور سے ہیوم کے متعلق یہ بدگمانی کیجاتی ہے کہ اس نے فلسفہ میں کسی نئی چیز کا اضافہ نہیں کیا، بلکہ اس نے اپنے پیشرو کے جھوٹے دعوی کو محض منطقیانہ نتیجہ تک پہنچا دیا ہے، لیکن اس کتاب کی مصنفہ نے ہیوم کے معترضین کو مدلل جواب دینے کی کوشش کی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ہیوم نے بعض ایسے مسائل کی بحث پہلی دفعہ چھیڑی ہے جو فلسفیون کے لئے آج تک بالکل معما ہیں،

اف، اس، مارون کی کتاب" کامٹے، عمرانیات کا بانی" ابھی حال میں شائع ہوئی ہے، اس کتاب مین فرانسیسی مفکر کے خیالات کا دلچسپ، ہمدردانہ اور ناقدانہ مطالعہ ہے، کامٹے کے دو نمایان کام ہیں، جن کو اس نے اپنی دو کتابوں" ایجابی فلسفہ" اور "ایجابی سیاست" میں قلمبند کیا ہے، پہلی کتاب مین اس نے دکھایا ہے کہ عمرانیات سائنس کا حقیقی اصول ہے، اس کے یہی خیالات ہر جگہ موجزن ہوتے ہیں، مورون کی کتاب کا بھی موضوع یہی ہے، دوسری کتاب میں اس نے وہ نظریے پیش کئے ہین جو آگے چل کر قوانین کی شکل میں رونما ہوئے، قوانین کے نظریہ کی ابتدا اسی سے شروع ہوئی،

گذشتہ سال" رسالہ فلسفہ" میں بعض دلچسپ مضامین نکلے ہیں،" افلاطون کی جمہوریت پر خیالات" کے عنوان سے ڈاکٹر اے۔ ای، گاروی نے ایک مقالہ لکھکر یہ بتایا ہے کہ آجتک افلاطون کے تخیل پر کوئی حکومت قائم نہیں ہوئی، اور نہ ہونے کی امید ہے، گو اس سے قریب تر حکومتین قائم ہوئین، اسی رسالہ مین ڈاکٹر ڈبلیو، ڈی، لیمونٹ نے" فلسفہ اور سائنس" پر ایک مضمون سپرد قلم کیا ہے، ڈاکٹر موصوف نے لکھا ہے کہ فلسفہ سائنس کے نظریوں اور عام آدمیون کی تیقنیات اور معتقدات کو اپنا موضوع قرار دیتا ہے، اور ان کو دنیاوی نقطۂ نظر سے ہم آہنگ بنانے کی

کوشش کرتا ہے، فلسفہ یہ نہین حل کرتا ہے کہ یہ یقینیات اور نظریے عملی واقعات کے مطابق ہین یا نہین، بلکہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے بالکل مطابق ہیں،" غیر متضاد چیزون" کا منطقیانہ اصول اس کا اصلی معیار ہے،

رسالۂ مذکور میں وائی کونٹ سموئیل نے" تمدن" پر ایک مقالہ لکھا ہے، جس میں اپنا خیال ظاہر کیا ہے کہ آیندہ تمدن کو مادیت سے آزاد ہونا چاہئے، ایک بلند پایہ تمدن صرف صنعت و حرفت کے آلات یا مشین اور کارخانون پر مشتمل نہیں ہوتا ہے، یہ تو انسان کی صرف جسمانی ضروریات کے کفیل ہوتے ہیں، تمدن میں ذہن کا نشو و نما بھی ضروری ہے، ذہن کا نمو ایسا ہونا چاہئے کہ وہ کچھ سوچ سکے، سمجھ سکے، روحانیت میں کچھ اضافہ کر سکے، اور روحانی لذتوں سے لطف اندوز بھی ہو سکے، ایک ایسا تمدن جس مین معاشی اجزا ردیوتا بنجائیں، انسانی روح کی مسرت کا باعث نہیں ہو سکتے ہیں، آیندہ فلسفہ اگر اپنے دیرینہ معتقدات سے پاک ہوا، سائنس اگر اپنی مادیت سے آزاد ہوا، اور مذہب اپنی ادعائی محکومیت سے مبرہ ہوا تو مستقبل کی روحانی اور ذہنی تعمیر صحیح معنون میں ہو سکتی ہے،

"ص ع"

مکتبہ جامعہ کی ایک نئی شاخ

اخبارِ علمیہ

ایک قدیم جگہ کا انکشاف

زمانۂ قدیم میں ارماگیڈون ایک مشہور جنگی میدان تھا، جہاں ہمیشہ لڑائیاں ہوا کیں، یہ ناصریہ سے ۱۰ میل جنوب کی طرف اور فلسطین کے ساحلِ بحرِ روم سے پندرہ میل پر واقع ہے، یہ نام اصل میں عبرانی لفظ ہرماگیدو تھا، جس کے معنی "پھل دار پہاڑ" یا "پسندیدہ شہر" کے ہیں، آج کل یہ صرف میگیڈو نام سے مشہور ہے، ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے پتہ چلایا ہے کہ اس کی جائے وقوع اس درہ کے دہانہ پر ہے جو مصر سے کرمل کی پہاڑیوں سے ہوکر دجلہ اور فرات کو جاتا ہے یہاں مصر کے فراعنہ نے اسیریا کے بادشاہ کے خلاف جنگ کی تھی، یہیں شاہ جوسیا فراعنہ سے لڑا تھا، اور یہیں مصر کا ٹھٹ موز ثالث میگیڈو کے بادشاہ اور اس کے حامیوں پر اپنے شہسواروں کی جانبازیوں سے غالب آیا تھا، یہیں جنگِ عظیم میں جنرل ایڈمنڈ ہنری الن بائی نے ترکوں کو زک دی تھی اور اس کارنامہ پر وہ میگیڈو کا لارڈ بنایا گیا تھا، انجیل کے قدیم مفسرین نے لکھا تھا کہ یہاں دنیا کی آخری تباہ کن جنگ ہوگی، اور عیسائی مذہب کے مخالفین کی فوجیں پسپا ہونگی،

اب سے سو برس پہلے فلسطین کا ایک ماہرِ آثارِ قدیمہ پروفیسر ایڈورڈ رابنسن اس مقام پر آیا تھا، لیکن صحیح جگہ کا پتہ نہ چلا، اس زمانہ میں صرف ظاہری اور سطحی آثار سے زمین کے نیچے

دبے ہوئے تاریخی مقامات کا اندازہ لگانا ہوتا تھا، لیکن اب تو یہ کام باضابطہ کھودائی سے آغاز کیا جاتا ہے، چنانچہ اس جگہ پر کھودائی کا کام ۱۹۲۵ء میں شکاگو یونیورسٹی کی طرف سے شروع ہوا، اور تعجب کی انتہا نہ رہی، جب اندر سے مصری بادشاہوں کے محل برآمد ہوئے، اس کے کمرے منقش ہیں اور غسل خانوں میں سیپ کا فرش ہے، پتھر سونے، لاجورد، ہاتھی دانت اور گنگا جمنی کے کام کی صنعتیں کثرت سے موجود ہیں، شنی شنک نامی فرعون کا ایک کتبہ بھی ہے، اسی نے یروشلم کی غارتگری کی تھی، حضرت سلیمانؑ کا بنایا ہوا اصطبل بھی صحیح سالم ہے، اس کی وسعت اتنی ہے کہ اس میں تین سو گھوڑے رہتے ہونگے،

کھودنے والوں کا دعویٰ ہے کہ وہ آخری تہ تک پہنچ گئے ہیں، کل بیس تہیں ہیں، آخری تہ میں ایک عصرِ حجریہ کا غار ہے، جس میں چقماق کے اوزار اور ہڈیاں ملی ہیں، انیسویں تہ میں جانوروں اور انسانوں کی تصویریں کھنچی ہوئی ہیں، اٹھارہویں تہ میں ایک پتھر کی محصور دیوار ہے جو پندرہ فیٹ اونچی اور ۲۴ فیٹ چوڑی ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ تین ہزار برس قبل مسیح بھی جنگ کا سلسلہ جاری تھا،

خوردبین کی ایک نئی ایجاد

جرمنی کے سائنس دانوں نے ایک نئی خوردبین ایجاد کی ہے جس سے خوردبینی کی قوت میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا ہے، اس نئے آلہ میں چھوٹی چیزوں کو بڑی دیکھنے کے لئے عام آلات کی طرح روشنی کی لہریں استعمال نہیں کیجاتی ہیں، بلکہ برقیہ (ELECTRON) کی شعاعوں کو کام میں لایا جاتا ہے، جدید طبعیات کی رو سے روشنی کی شعاعوں میں ذرات اور لہریں ہوتی ہیں، برقیہ کی شعاعوں میں بھی لہریں اور ذرات ہیں، لیکن ایک خوردبین میں جب مرئی چمک استعمال کیجاتی ہے تو روشنی کی لہروں سے اس کی خوردبینی کی قوت محدود ہوجاتی ہے، ذرات روشنی کی لہروں

سے چھوٹے ہوتے ہیں، اور وہ اس کے جال کے اندر سے اس طرح گذر جاتے ہیں کہ بالکل معلوم نہیں ہوتے، برقیہ کی لہریں ایک لاکھ گنا کم چھوٹی ہوتی ہیں، برقیہ کسی دوربین کے شیشہ سے مرکز کی طرف مائل تو نہیں ہوسکتا، البتہ برقی اور مقناطیسی قوتوں کے ذریعہ سے ہوسکتا ہے، کیونکہ ان کا ردعمل برقیہ کی شعاعوں پر اسی طرح ہوتا ہے جس طرح کہ شیشہ کا روشنی پر،

برقیہ سے خوردبین کی تیاری کی کوشش دس سال سے جاری تھی، ۱۹۲۷ء میں جرمنی کے سائنس دانوں میں یہ خیال پیدا ہوا، اس سلسلہ میں بلجیم کے ماہرین فن نے بھی کچھ کام کیا، لیکن ڈاکٹر چنٹن جوزف ڈیویسن نے اس کو بڑی ترقی دی، اس نے برقیہ میں لہروں کو ظاہر کر کے دکھایا ہے، چنانچہ گذشتہ سال اس کو نوبل کا انعام بھی ملا،

چند سال پیشتر اوناوہ کے ایک ہیئت داں نے خیال ظاہر کیا تھا کہ ستاروں کی دھیمی روشنی کو برقی تصویر کے ذریعہ سے برقی لہروں میں منتقل کر کے ایک برقیہ کی دوربین تیار کی گئی ہے، جس میں دو ہزار انچ کے شیشے کی دوربین کے برابر قوت پیدا ہوگی، لیکن اب اسی قسم کی خوردبین جرمنی میں تیار کر لی گئی ہے، اس میں آٹھ ہزار وولٹ یعنی برقی حرکت کی قوت ہے اب تک جتنی خوردبینیں استعمال میں ہیں ان سے پچیس گنا زیادہ طاقتور ہے، اس کے ذریعہ سے تصویریں بھی لیجا سکتی ہیں، چنانچہ ریم کے جراثیم کی تصویریں لی گئی ہیں، جو انگریزی سکہ پنی کے برابر آئیں، حالانکہ اب تک خوردبینوں کے ذریعہ سے ان جراثیم کی جتنی تصویریں لی گئی تھیں وہ آلپین کے سر سے زیادہ بڑی نہیں ہوتی تھیں،

برقیہ کی تصویر

کیلیفورنیا کے ڈاکٹر کارل ڈیوڈ انڈرسن نے سائنس کی بعض عجیب و غریب چیزوں کا انکشاف

کیا ہے، اس نے ۱۹۳۲ء میں برقیہ کی تصویر لی جس کے صلہ میں اس کو نوبل کا انعام ملا، یہ تصویر سائنس کا ایک بہت بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے، حال میں اسی قسم کے ایک دوسرے ذرہ کی تصویر شائع کی ہے، جو پہلے سے کم اہم نہیں، یہ ذرہ "وزنی برقیہ" کے نام سے منسوب ہے، ڈاکٹر انڈرسن نے اس ذرہ کی تحقیق ۱۹۳۶ء میں شروع کی تھی، اور اب اس کو دریافت کر لیا ہے، اتفاق سے ہارورڈ کے دو سائنس دانوں کو بھی اس کی تحقیق میں کامیابی ہوئی ہے،

یہ عجیب و غریب چھوٹے ذرے زمین سے دس میل اوپر کی سطح پر کائناتی شعاع اور ہوا کے ذروں کے تصادم سے ظہور پذیر ہوتے ہیں، عام برقیہ سے ان کی ضخامت ایک سو دس سے چار سو گنی تک زیادہ ہوتی ہے، ڈاکٹر انڈرسن نے اس برقیہ کی تصویر لینے میں اپنے کو ایک ایسے معمل میں بند کر لیا تھا، جس کو اس نے مصنوعی ارگون (ایک گیس جو ہوا کی ترکیب میں داخل ہے) ہیلیم (ایک شفاف گیس جو فضائے آفتاب میں پائی جاتی ہے) اور الکوحل کے بخارات سے بھر دیا تھا، یہاں ذرہ، برق (IONS) میں گیس کے ذرہ سے باہر آکر ٹکراتا تھا، اور بخار برق کے اوپر آکر منجمد ہو جاتا تھا، اسی طرح اس کی تصویر کھینچنا آسان ہو گیا، چنانچہ ڈاکٹر مذکور نے اس کی تصویر بھی شائع کر دی ہے، اور اندازہ لگایا ہے کہ اس میں ایک کرور وولٹ کی قوت ہے،

"ص ع"

باب التقریظ والانتقاد

برہان مآثر

فارسی مولفہ سید علی طبا طبا، تقطیع کلان، صفحات ۶۳۲، مطبوعہ جامعہ ملیہ قیمت عہ (دس روپیہ) غیر ممالک کے لئے ایک پونڈ انگریزی، پتہ: معتمد مجلس مخطوطات فارسیہ حیدرآباد دکن،

حیدرآباد دکن کی علمی خدمات میں سے ایک اور مفید چیز "مجلس مخطوطات فارسیہ" کا قیام ہے، جو فارسی کی کئی قلمی کتابوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتی اور اہتمام سے چھاپتی ہے، زیر تبصرہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے،

یہ اسوقت تک چھپی نہ تھی، اس نے ہندوستان اور غیر ملکوں کے کئی نسخوں سے مقابلہ کرکے اچھے کاغذ پر صفائی کے ساتھ ٹائپ کے حرفوں میں اسکو شائع کیا ہے،

شروع میں جناب سید ہاشمی صاحب معتمد مجلس کا دلچسپ مقدمہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے نسخے کہاں کہاں ہیں، اور عام مورخوں کے نزدیک اس کتاب کا کیا پایہ ہے، پھر اس کے عنوانوں کی فہرست ہے، اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے،

مصنف کا نام جیسا کہ اس نے آپ مقدمہ میں بتایا ہے، علی بن عزیز اللہ طبا طبا، اور اس کتاب کا تاریخی نام "برہان مآثر" ہے[1]، برہان مآثر کے اعداد ایک ہزار ہیں، لیکن سنہ ۱۰۰۰ھ اسکی تالیف کی نہیں بلکہ

[1] مقدمہ کتاب ص ۴،

آغاز تالیف کی تاریخ ہے، کیونکہ اس کا اختتام چاند سلطانہ کی اس جنگ پر ہے، جو شاہزادہ مراد سے سنہ ۱۰۰۴ھ میں ہوئی تھی[1]، اور اسی سے معلوم ہوتا ہے، کہ مصنف کی عمر کا پیمانہ اسی سنہ یا اس سے قریب تر سنہ میں لبریز ہوگیا، ورنہ برہان نظام شاہ کے بعد دوسرے پانچ بادشاہوں کا حال بھی وہ تحریر کرسکتا تھا، میرے اس خیال کی تائید فرشتہ کے اس بیان سے ہوتی ہے،

دور وقائع نظام شاہیہ کہ سید علی سمنانی
در عہد برہان نظام شاہ ثانی می نوشت
و توفیق اتمام نہ یافت، فوت شد چنین
مرقوم است[1]

اور وقائع نظام شاہیہ میں جس کو
سید علی سمنانی نے برہان نظام شاہ ثانی
کے عہد میں تحریر کیا ہے، اور ناتمام چھوڑ کر
فوت ہوگیا، اس طرح لکھا ہے،

اس سے پتہ لگا کہ "وقائع نظام شاہیہ" کا مصنف یہی سید علی ہے، اور وہ برہان نظام شاہ کے حکم سے اس کو لکھ رہا تھا، کہ فوت ہوگیا، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ گو تاریخی نام اس کا بُرہان مآثر ہے، مگر عام طور پر اس عہد میں اس کو "وقائع نظام شاہیہ" کہتے تھے، جیسا کہ خود تاریخ فرشتہ کا اصلی نام گلزار ابراہیمی چھوڑ کر اسکو تاریخ فرشتہ کہنے لگے،

فرشتہ سنہ ۱۰۳۶ھ تک زندہ تھا، اور یہ قلمی نسخہ جس سے یہ زیر تبصرہ کتاب مرتب کی گئی ہے، مصنف کے لڑکے ابو طالب بن سید علی طبا طبا الحسنی محرم سنہ ۱۰۳۵ھ کا لکھا ہے، اور نظام شاہی سلطنت کا خاتمہ سنہ ۱۰۴۶ھ میں ہوا، پس مصنف اگر زندہ ہوتا، تو غالباً نظام شاہی سلطنت کی تاریخ مکمل کر ڈالتا،

وقائع نظام شاہیہ اور برہان مآثر دونوں ایک ہی کتاب کا نام ہونا، اس سے ظاہر ہے کہ فرشتہ نے جو واقعات وقائع نظام شاہیہ کے حوالہ سے نقل کئے ہیں، وہ بجنسہ اس برہان مآثر میں موجود ہیں، یہ کتاب تین طبقوں پر تقسیم کی گئی ہے، طبقہ اول میں ان سلاطین بہمینہ کا حال ہے، جن کا پایہ تخت گلبرگہ

[1] فرشتہ جلد دوم ص ۱۵۹، [2] فرشتہ جلد دوم ص ۹۰ نولکشور،

رہا، طبقۂ دوم میں پایۂ تخت بیدر کے سلاطینِ بہمنیہ کا ذکر ہے، اور طبقۂ سوم میں نظام شاہی سلطنت کا حال ہے، جنکا پایۂ تخت احمد نگر تھا،

مصنف نے اپنی کتاب میں سلاطینِ بہمنیہ کا حال ابتدا سے سلطان محمود بن سلطان محمد بہمنی تک لکھا ہے، کیونکہ اسی عہد میں نظام الملک بحری کے لڑکے احمد نے جنیر اور بعد میں احمد نگر کو پایۂ تخت بنا کر ایک جدید سلطنت نظام شاہیہ کی بنیاد رکھی، اور مصنف کو اسی سلطنت کا حال لکھنا مدنظر ہے، جس کے فرماں روا برہان نظام شاہ ثانی متوفی سنہ ۱۰۰۳ھ کے حکم سے اس کتاب کی ابتدا کی،

مصنف نے غالباً اختصار کے خیال سے بعض اہم واقعوں کو نظر انداز کر دیا ہے، مثلاً سلطان علاء الدین بہمنی کے حملۂ گجرات کا کوئی ذکر اپنی کتاب میں نہیں کیا ہے، حالانکہ اس واقعہ کی اہمیت اسلئے زیادہ ہے، کہ سلطان موصوف کی وفات اسی کے سبب سے وقوع میں آئی،[1]

ص ۱۶ میں سلطان مالوہ کا نام اس کتاب میں "الخان" (ال خان) لکھا ہے، خیال ہوا کہ شاید کاتب (کمپوزیٹر) کی غلطی ہو، لیکن جب غلط نامہ میں بھی یہی دیکھا، تو خیال گذرتا ہے، کہ اصل نسخہ ہی میں غلطی ہوگی، کیونکہ مالوہ کے سلطان ہوشنگ کا نام الپخاں (الپ خان) تھا، ال خاں نہیں،

مصنف نے سنین لکھنے میں بھی بڑے بخل سے کام لیا ہے، جس سے واقعات کا تسلسل نظر انداز ہو جاتا ہے، اسی طرح اپنے ماخذ کا ذکر بھی وہ اتفاقیہ ہی کرتا ہے، حالانکہ اسکی سخت ضرورت تھی،

بعض مقامات پر ایسی طبع زاد باتیں لکھی ہیں، جنکو نہ عقل قبول کرتی ہے، اور نہ کسی دوسری تاریخ سے اس کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ گجراتی بادشاہ محمود بیگڑہ کی نسبت کہتا ہے کہ اس نے خاندیس پر صرف اس لئے حملہ کیا، کہ وہاں کے حاکم نے اپنا نام محمود رکھا تھا، مصنف کی اصل عبارت یہ ہے،

"دریں وقت سلطان محمود گجراتی کہ بہ نخوت جاہ و غرور و شوکت موفور سیاہ مغرور بود

[1] فرشتہ جلد اول ص ۲۰۰، نولکشور۔

از راہ عدالت و انصاف دور ۔۔۔۔۔۔۔ چون استماع نمود کہ حاکم برہان پور (خاندیس) خویشتن را محمود شاہ می نامد، از غیرت ۔۔۔۔۔۔۔ بر خویشتن بپیچید و گفت، برہان پوری راچہ یارا ے آن کہ با بندگان ما در اسم و لقب شرکت نماید، یا در مقام برابری در آید"[1]

گجراتی بادشاہوں میں سلطان محمود ہی سب سے زیادہ عادل اور بڑے جاہ و جلال کا بادشاہ گذرا ہے، اس نے خاندیس پر سنہ ۹۰۰ھ میں صرف اسلئے حملہ کیا تھا، کہ حاکم خاندیس نے خراج نہیں ادا کیا، حالانکہ وہ کئی پشت سے گجراتی بادشاہوں کا باجگذار چلا آتا تھا،

مصنف نے ایک اور واقعہ اسی طرح کا سلطان محمود بیگڑہ کی نسبت لکھا ہے، کہ ۹۰۵ھ میں حاکم خاندیس کی مدد کے لئے احمد نظام شاہ نے سلطان محمود گجراتی کے برخلاف فوج کشی کی، اور چونکہ اس کے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتا تھا، اس لئے گجراتی فیلبانوں کو ملا کر رات کے وقت مست ہاتھیوں کو کھول دیا، تاکہ گجراتی لشکر کو روند ڈالے، اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر خود اس نے شبخون مارا جس سے گجراتی لشکر کو شکست ہوئی،[2]

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جنگ میں ایسے واقعات رونما نہیں ہوتے، بلکہ بہ کثرت ہوتے ہیں لیکن کوئی تاریخ اس واقعہ کی مؤید نہیں، ہی، حالانکہ اسی قسم کا واقعہ احمد شاہ اول کے ساتھ جنگ مالوہ کے وقت پیش آیا، وہ تاریخوں میں مفصل موجود ہے،

اس کتاب کے مطالعہ کے وقت پڑھنے والے پر جو خاص اثر ہوتا ہے، وہ یہ ہے، کہ مصنف اپنے وقت کا بڑا ماہر ادیب ہے، شروع سے آخر تک اس کی عبارت یکساں ادیبانہ ہے، بعض دفعہ تو اس طرز کے سبب سے مطالب میں پیچیدگی آجاتی ہے، اور اسی باعث کتاب کا حجم بڑھ گیا ہے،

[1] برہان ماثر ص ۲۲۰،

[2] کتاب مذکور ص ۲۲۴،

لیکن اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ تاریخِ دکن کے لئے یہ بہترین مواد ہے، کیونکہ آخر کے تمام واقعات مصنف کے چشم دید ہیں،

آخر میں فاضل مرتب نے کتاب میں آئے ہوئے ناموں اور مقاموں کی فہرست بھی دیدی ہے جو آج کل کے مہذب ملکوں کے مطبوعات میں ایک ضروری چیز سمجھی جاتی ہے،

مجلس مخطوطات اور معتمد صاحب مجلسِ مخطوطات کا یہ کارنامہ اہلِ تاریخ کی طرف سے شکریہ کا مستحق ہے، "اظ"

انڈیا آفس کے کتب خانہ کی عربی قلمی کتابوں کی فہرست جلد دوم

کتبِ اصولِ فقہ

انڈیا آفس کے مشہور کتبخانہ میں عربی زبان کی قلمی عربی کتابوں کی فہرست جلد وار شائع ہو رہی ہے اس وقت ہمارے سامنے اس فہرست کی دوسری جلد کا تیسرا نمبر ہے، اس میں فقہ کی کتابوں کا تذکرہ ہے اس کے مرتب ریبن لیوی ایم اے لٹ ڈی (REUBEN LEVY M.A. LITT.D) ہیں، جو کیمبرج یونیورسٹی میں فارسی کے لکچرر ہیں، پچھلے سال ۱۹۳۷ء میں یہ جلد چھپکر شائع ہوئی، اور کتب خانہ مذکور کی عنایت سے ہم تک پہنچی ہے، یہ ص ۱۹۹ سے شروع ہو کر ص ۳۳۶ پر تمام ہوئی ہے اور نمبر ۱۴۲۲ سے لیکر نمبر ۱۸۱۸ تک کی کتابوں کو شامل ہے،

اصول فقہ کی جن کتابوں کے نام ہیں، وہ اکثر عام ہیں، لیکن بعض خاص اہمیت رکھتی ہیں، ان میں سے ایک کا نام لوح پر "التمهید فی اصول الفقہ" ہے، نسخہ ۵۰۳ھ کا ہے، لیکن اس میں مصنف کا نام نہیں، گولڈزیہر مستشرق نے اس کو امام شافعی کی طرف منسوب کیا ہے، حالانکہ مباحث کی فہرست پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ کتاب اس زمانہ کی نہیں ہو سکتی، (یہ فہرست اس کیٹلاگ میں دیگئی ہے)

اس کیٹلاگ کے فاضل مرتب کا بیان ہے کہ التمهید کے نام سے حاجی خلیفہ نے کسی کتاب کا ذکر نہیں کیا ہے، مگر واقعہ ایسا نہیں ہے، اصولِ فقہ میں حسب ذیل کتابوں کے نام حاجی خلیفہ نے لئے ہیں، ایک تمهید القواعد الاصولیۃ والفروعیۃ زین الدین العاملی المتوفی ۹۶۶ھ کی اصولِ امامیہ میں، دوسری تمهید فی تنزیل الفروع علی الاصول جمال الدین اسنوی شافعی المتوفی ۷۷۲ھ کی، مگر غالباً کتاب مذکور ان دو میں سے کوئی نہیں، یہ دونوں متاخرین، اور ان کے مضامین بھی الگ ہیں،

اصول کے بعد فقہ کی کتابوں کی تشریح ہے، جن میں زیادہ تر متاخرین کی تصنیفات ہیں، فاضل مرتب نے کتابوں اور مصنفوں کی تلاش میں محنت کی ہے، ہندوستان میں بانکی پور، آصفیہ اور بوہار کی لائبریریوں کی فہرستوں کے حوالے دیئے ہیں،

یہ افسوس کی بات ہے کہ عربی الفاظ میں نقطوں وغیرہ کے دینے کی پروا نہیں کی گئی ہے، الفتاوی السراجیہ کے آخر میں جو شعر ہیں وہ غلط ہیں، نثر میں بھی غلطی ہے، چھپی ہوئی عبارت یوں ہے؛

وانسد نی القاضی الامام ابی زید الدبوسی رحمہ اللہ علیہ، شعر جهدت لنا صیل الدمائل فی الوری فوفقنی ربی مما طاش عن سهمی، فاجیبت ما قدمات عن سنن الهدی لمستنبطی الاحکام بالرای والفهم، تمت الکتاب الخ

فتاوی سراجیہ کا قلمی نسخہ جو دارالمصنفین میں ہے اس کے آخر میں یہ عبارت نہیں، کتاب الفوائد آخری باب ہے، جس میں بزرگوں کی علمی خدمات اور محنتوں کا ذکر ہے جس میں آخری واقعہ حضرت زفر کا ہے اگر یہ مصنف کی عبارت ہو اور انشدنی کی یائے متکلم مفعول سے مقصود مصنف ہو تو یہ قطعاً غلط ہوگا، کیونکہ اس کا مصنف چھٹی صدی ہجری کے اواخر میں تھا، اور امام ابوزید دبوسی نے ۴۳۰ھ میں وفات پائی، ہی ممکن ہے کسی اور کا قول ہو،

بہرحال یہ عبارت صحیح یوں ہوگی وانشدنی القاضی الامام ابوزید الدبوسی رحمۃ اللہ علیہ

شعر جمعت تفاصیل الفضائل فی الوری — فرفقنی ربی بما طاش عن سھمی

فاجیبت ما قد مات عن سنن الھدی — لستنبطی الاحکام بالرای والفھم

نصاب الاحتساب، محتسبوں کے فرائض پر ایک عمدہ کتاب ہے، اس کے مصنف کا نام عمر بن محمد بن عوض ہے، مگر ان کی نسبت لوگوں نے شامی بیان کی ہے، یہ غلطی اصل میں حاجی خلیفہ سے ہوئی ہے، اور سب نے اسی کی پیروی کی ہے، علامہ کرد علی شامی نے اپنے پرانے رسالہ المقتبس میں بھی غلطی کی اور اسی کا اعادہ انھوں نے اپنی مشہور کتاب خطط الشام جلد اول صہ ۱۴ میں کیا ہے، بانکی پور لائبریری (جلد ۱۹ ص ۱۶۹۵) آصفیہ (۲ ص ۱۱۰۵)، برلن اور مصر کی فہرستوں میں بھی یہی غلطی ہے، اصل صحیح لفظ سُنامی (س ن ا م ی) ہے، سنام ہندوستان میں موجودہ ریاست پٹیالہ میں ایک قصبہ ہے، جہاں چند مشہور علماء پیدا ہوئے ہیں، مصنف اسی ہندوستان اور سنام کے رہنے والے تھے، ان کو ملک شام سے کوئی تعلق نہیں، فوائد فیروزشاہی میں اس کتاب کا حوالہ ہے، کتاب کلکتہ میں ٹائپ میں چھپ چکی ہے، اس میں صحیح نام سنامی چھپا ہے، انڈیا آفس کے اس نسخہ میں سمنی بھی تصحیف ہے، خود کتاب کے اندر اس کے ہندوستانی الاصل ہونے کی شہادت ہے، پان کھانے کا بیان ہے، ہندو کے ہاتھ سے دودھ، گھی، دہی خریدنے کا ذکر ہے، اور تذکرۂ علمائے ہند میں ان کا حال درج ہے، (صہ ۹۸) اخبار الاخیار محدث دہلوی (ذکر ضیاء الدین سنامی) قاضی ضیاء الدین سنامی کے نام سے مشہور ہیں، حضرت سلطان الاولیاء نظام الدین کے معاصر تھے،

"س"

مطبوعاتِ جدیدہ

خطباتِ صدارت:- شائع کردہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، تقطیع بڑی، ضخامت ۲۳۶ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مرقوم نہیں، پتہ:- دفتر کانفرنس صدر جہاں منزل علیگڈھ،

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی پنجاہ سالہ جوبلی کے موقع پر مسلمانوں کے (اور بعض ہندو مسلمانوں کے مشترک) اہم تعلیمی، علمی، اقتصادی، معاشرتی، صحافتی اور لسانی لائق غور مسائل کے لحاظ سے، کانفرنس کے اجلاس کے گیارہ شعبے قرار دیئے گئے تھے، (۱) معاشیات و اصلاح معاشرت، (۲) تعلیم نسواں (۳) ابتدائی تعلیم اور مدارس اردو (۴) اعلیٰ تعلیم (۵) اردو پریس، (۶) اسلامی علوم و فنون، (۷) مدارس اسلامیہ (۸) خواندگی اور تعلیم بالغان، (۹) زبان اردو (۱۰) صنعتی تعلیم (۱۱) ثانوی تعلیم، اور ان کی صدارت کے لئے ان شعبوں کے ہندوستان کے نامور علماء اور ماہرین فن کا انتخاب کیا گیا تھا جن کے نام بہ ترتیب یہ ہیں، پروفیسر الیاس برنی ناظم دارالترجمہ سابق پروفیسر معاشیات، شیخ عبداللہ صاحب سکرٹری گرلز کالج علی گڈہ، سید آل علی صاحب نقوی انسپکٹر مدارس اسلامیہ، عبداللہ یوسف علی صاحب، مولوی بشیرالدین صاحب اڈیٹر البشیر، منشی دیانرائن صاحب نگم اڈیٹر زمانہ، مولنا سید سلیمان ندوی، مولانا حسین احمد صاحب مدنی، مولوی سید طفیل احمد صاحب، مولوی عبدالحق صاحب بی اے، خان بہادر اے جی خان، ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب، کانفرنس نے ان سب کے صدارتی خطبوں کا مجموعہ کتابی صورت میں

شائع کر دیا ہے، ان پر فرداً فرداً تبصرہ کرنا طویل بھی ہے اور بے کار بھی، ان کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ یہ خطبے متعلقہ شعبوں کے مسلمہ ماہرین اور نامور علماء کے معلومات، تجربات، دماغی کاوشوں اور زرین مشوروں کا خلاصہ اور عطر ہیں، کانفرنس نے انہیں شائع کرکے بڑی مفید خدمت انجام دی ہے، اور ہمارے ہاتھوں میں ایک ایسی کتاب دے دی ہے جس کی روشنی میں ہم اپنی قومی ترقی کے وسائل کی گذشتہ تاریخ کا جائزہ لے سکتے ہیں، موجودہ حالات کا اندازہ کر سکتے ہیں، اور آیندہ کے لئے صحیح راہِ عمل متعین کر سکتے ہیں، اگر ناگواری طبع کا باعث نہ ہو تو اتنا عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ تعلیم نسواں کے باب میں شیخ عبداللہ صاحب کے خدمات مسلم اُنکے مشورے صحیح اُن کا خطبہ مفید لیکن تعلیم نسواں کی ضرورت کے بارہ میں انھوں نے جو دلائل دیئے ہیں اور اس کی راہ کے جو موانع بتائے ہیں، ان میں سے بعض آج سے چوتھائی اور نصف صدی پیشتر کچھ وزن رکھتے ہوں تو رکھتے ہوں، لیکن آجکل ایسی سطحی باتوں کی کوئی وقعت نہیں،

ہندوستان کا نیا دستورِ حکومت، مؤلفہ پنڈت کشن پرشاد صاحب کول، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۶۷ صفحے، خط ٹائپ، قیمت مرقوم نہین، پتہ:- ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد،

اردو میں ہندوستان کے نئے دستور حکومت پر متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں، اب ہندوستانی اکیڈمی نے اردو کے مشہور صاحب قلم پنڈت کشن پرشاد صاحب کول سے یہ کتاب تالیف کرائی ہے، یہ کتاب اختصار، جامعیت، ترتیب، طرز تحریر اور طریقہ تفہیم ہر اعتبار سے گذشتہ سب کتابوں میں بہتر ہے، اس میں اختصار اور جامعیت کے ساتھ دستور جدید کے دونوں شعبوں صوبہ جاتی خود مختاری اور فیڈریشن کا خاکہ اس سلیقہ سے پیش کیا گیا ہے کہ اس کا پورا نقشہ ذہن میں آجاتا ہے، اور اس کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کے پرانے آئین میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں اور اس نئے آئین میں ہندوستانیوں کو کیا کیا نئے اختیارات ملے

آخر میں جدید دستور سے پیدا شدہ نئے اہم مسائل مالیات، پبلک سروس، فیڈرل کورٹ، تجارتی تحفظات کانسٹی ٹیوٹ پاورس، وزیر ہند، انڈیا کونسل، ریلوے، رزروبینک وغیرہ کو بھی لکھدیا ہے، یہ کتاب ہر لحاظ سے مطالعہ کے قابل ہے، جدید دستور سے واقفیت حاصل کرنے والے اردو داں طبقہ کو اسکا ضرور مطالعہ کرنا چاہیئے، طباعت کے اغلاط البتہ بہت ہیں، متعدد مقاموں پر "عملہ" کا املا "املہ" نظر آیا، بعض مقاموں پر شرائط کو شرائت لکھا گیا ہے، جو طباعت کی غلطی ہے اور اس قسم کی خفیف غلطیاں ہیں،

تذکرہ رحمانیہ: مؤلفہ جناب قاری عبدالحلیم صاحب انصاری پانی پتی تقطیع بڑی ضخامت ۲۸۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مرقوم نہیں، پتہ:- دارالاشاعت رحمانیہ پانی پت۔

تیرہویں صدی ہجری کا آخری اور چودھویں صدی کا ابتدائی زمانہ ہندوستان میں علم و عرفان کی آخری بہار اور ہمارے قدیم علماء اور صلحاء کا آخری دور تھا، اس میں علم و عمل شریعت و طریقت کی تمام مقدس یادگاریں ایک ایک کرکے اُٹھ گئیں، ان میں مولانا قاری محمد عبدالرحمٰن صاحب محدث انصاری پانی پتی جامع شریعت و طریقت بزرگ اور حضرت مولانا محمد اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ فیض کی ایک ممتاز یادگار تھے، مولانا کے نبیرہ قاری محمد عبدالحلیم صاحب انصاری خطیب جامع مسجد و مہتمم معلم دینیات حالی مسلم ہائی اسکول پانی پت نے "تذکرہ رحمانیہ" کے نام سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت قلمبند فرمائی ہے، اس میں مولانا کے نسب، خاندان، پیدائش، تحصیل علم، اساتذہ، علمی خدمات، درس و تدریس، وعظ و پند، تلامذہ، ترویج شریعت، اتباع سنت، امحاے بدعت، تصحیح عقائد، فتاوی، تصانیف کمالات باطنی، مجاہدات و ریاضات، فیوض روحانی، کشف و کرامات، اخلاق و شمائل وغیرہ کے تفصیلی حالات ہیں، مولانا ایسے دور کے بزرگ تھے جبکہ علماء و صلحاء کے لحاظ سے ہندوستان واقعۃً جنت نشان تھا، اس لئے ضمناً اس عہد کے بہت سے بزرگوں کے حالات اور بعض تاریخی واقعات آگئے ہیں، اگرچہ اب زمانہ کا مذاق بدل چکا ہے، لیکن اب بھی پرانے آثار کو عقیدت کی نگاہ سے دیکھنے والے موجود ہیں، امید ہے کہ ان میں یہ کتاب مقبول ہوگی،

صلوۃ وسلام، مرتبہ مولانا احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ العلماء، تقطیع اوسط، ضخامت ۶۴ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۵ر پتہ:- دینی بکڈپو کوچہ ناہرخاں دہلی،

مولانا احمد سعید صاحب نے درود شریف کے فضائل پر یہ رسالہ تالیف فرمایا ہے، یہ چار بابوں میں تقسیم ہے، پہلے باب میں درود شریف پڑھنے کے فضائل اور تارکین درود کی وعید کی روایتیں ہیں، دوسرے میں آیہ کریمہ ان اللہ وملٰئکتہ یصلون علی النبی الآیہ کے بعض واعظانہ نکات ولطائف، آنحضرت صلعم اور دیگر انبیاءؑ کے بعض قرآنی خطابات کا موازنہ، درود شریف کے نکات اور ان سے پیدا شدہ بعض شبہات کا جواب، درود میں آنحضرت صلعم کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آل ابراہیمؑ کی شرکت کے اسباب ومصالح، درود پڑھنے کے مواقع اور اس کے آداب کا ذکر ہے، تیسرے باب میں درود شریف کے فضائل و برکات کے حکایات وقصص ہیں، چوتھے میں مختلف درودوں کا ذکر ہے، مولانا کی دوسری تصانیف کی طرح ان کا یہ رسالہ بھی واعظانہ رنگ کا دلپذیر رسالہ ہے،

جگ بیتی: مولفہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی تقطیع اوسط، ضخامت ۶۶ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مرقوم نہیں، پتہ:- انجمن ترقی اردو اورنگ آباد۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ مثنویوں نے اردو زبان کی بڑی خدمت کی لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے اردو کی اکثر مثنویاں بہت گری ہوئی اور بے معنی ومقصد اور خلاف عقل داستانوں سے بھری ہوئی ہیں، دور جدید کے متعدد شعراء نے اس کی اصلاح کا قدم اٹھایا ہے، اور مولانا حالی کے زمانہ سے اس وقت تک متعدد اخلاقی مثنویاں لکھی گئیں، یا کم از کم اخلاقی حیثیت وہ قابل اعتراض نہیں کہی جاسکتیں، پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کی یہ مثنوی اس نئے

رنگ میں اردو شعراء کے لئے قابل تقلید نمونہ ہے، یہ ایک اخلاقی اور سبق آموز قصہ ہے، اس کی تفصیل کی اس مختصر ریویو میں گنجایش نہیں، اس میں ترکِ دنیا کی مذمت، خدمتِ خلق کی ترغیب، قومی خدمت کی تعلیم، انسانی فطرت کے اچھے برے پہلوؤں کی تمثیل، اعمال بد کی سزا، حسنِ عمل کی جزا، بہت سی اخلاقی باتوں کو قصہ کے پیرایہ میں نہایت دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے، اشخاص کے ناموں اور ان کی سیرت میں مناسبت کا لحاظ رکھا گیا ہے، مثلاً "سیوک رام"، "خدمت رائے"، "عصمت اللہ" اور "جانکی" وغیرہ اس مثنوی کی دوسری نمایاں خصوصیت بحروں کا تنوع ہے، اس کی ہر فصل یا ہر بند کی بحر جن کی تعداد پچیس ہے، علٰحدہ علٰحدہ ہے اس لئے بحروں میں بڑی رنگارنگی پیدا ہو گئی ہے، لیکن اس طرز کے نامانوس ہونے کی وجہ سے ایک بحر کو ختم کرنے کے بعد طبیعت دفعۃً دوسری بحر کو قبول کرنے کے لئے مشکل سے آمادہ ہوتی ہے، ایک مثنوی میں تسلسل بیان کو قائم رکھتے ہوئے اتنی بحروں کو جمع کر دینا کیفی ہی صاحب جیسے قادر الکلام شاعر کا کام تھا، اس مثنوی کی معنوی خصوصیات کو ہمارے شعراء کو نمونہ بنانا چاہئے،

صبحِ مشرق: مصنفہ میاں محمد صادق صاحب ضیا، وکیل آگرہ، تقطیع اوسط، ضخامت ۲۵۶ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت: مجلد عہ، پتہ:- مکتبہ قصر الادب آگرہ،

میاں محمد صادق صاحب ضیا چنیٹوی ہونہار شعراء میں ہیں، ادبی رسائل کا مطالعہ کرنے والے انکے کلام سے ناواقف نہ ہونگے، قصر الادب آگرہ نے "صبحِ مشرق" کے نام سے انکے کلام کا مجموعہ شائع کیا ہے، یہ چار حصوں میں تقسیم ہے، "اذانِ زندگی"، "نوائے فطرت"، "عصرِ رنگ و بو" اور "گلبانگ" پہلے حصہ میں مختلف رنگ کے منظومات ہیں، دوسرے میں فطری مناظر کی نظمیں، "عصرِ رنگ و بو" کی سرخی انکی منظومات کی خود ترجمان ہے، اسمیں شباب و متعلقاتِ شباب کی تصویریں ہیں اور گلبانگ میں غزلیں، ضیا صاحب فطری شاعر ہیں، انکے کلام میں شاعری کے تمام عناصر موجود ہیں، غزل گوئی کے مقابلہ میں وہ بحیثیت ناظم کے زیادہ کامیاب ہیں، چنانچہ گلبانگ کے مختصر حصہ کے سوا پورا مجموعہ منظومات ہی کا ہے، اور اسمیں قومی، سیاسی، تاریخی، فطری جذبات، مناظرِ قدرت، ہر موضوع پر نہایت کامیاب نظمیں ہیں،

"م"